رموز
جون ایلیا
مرتب
خالد احمد انصاری

رموز

جون ایلیا

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انارکلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 37310944

ھماری کتابیں .....
خوبصورت، معیاری اور
کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت
صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com

ضابطہ

اشاعت : 2016ء
مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
مرتب : خالد احمد انصاری
مصور : دانش رضا
خطاط : محمد مختار علی
عکاس : سید محسن علی
قیمت : 500 روپے

جون ایلیا کے نام

اشاریہ

یُوحنا ایلیاہ
اور اُس کے چار ہم دم

اسد محمد خاں

پگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے ہرے نرم کانٹوں کا دائرہ لپیٹے' سوکھے بدن پر ارغوانی رنگ کا ٹاٹ اوڑھے' پیروں سے مُونجھ کی سینڈلیں باندھے بالسا وڈ[1] کی لمبی صلیب گھسیٹتا ہوا اب جو وہ اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک رفیق کے دروازے پر دستک دیتا چلا جائے گا کہ اے رفیق! اا اسد[2] اپنے مکان سے باہر آ اور اے' جاننے والے[3]' کچھ قدم میرے ساتھ چل اور اے' ایلی پاک دامن[4]' اے کشادہ دل حبیب' میری پیشانی کو بوسہ دے اور اے' جان برادر[5]' الوداع کہہ اور واویلا کر کہ میں اپنی صلیب اُٹھائے اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

---

[1] Balsa Wood استوائی امریکا کے جنگلوں سے حاصل ہونے والی لکڑی جو بہت ہلکی ہوتی ہے۔ اس سے کھلونے بنائے جاتے ہیں۔ گویا یہ صلیب جعلی ہے۔ [2] یہ عاجز جو بیان کر رہا ہے۔

[3] عبیداللہ علیم [4] کنور اطہر علی خان اطہر جیسی جو اس تمثیل میں کشادہ دل دوست کا گویا یسوع ناصری کے رفیق پطرس (Peter) کا کردار ادا کر رہا ہے۔

[5] بھائی محسن' جون ایلیا کے برادر بزرگ' سید محمد عباس۔

اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔

سو اس کی آواز کے اسیر اس کے یہ چاروں ہم دم اس کے ہم راہ ہولیں گے۔ وہ گریہ وزاری کرتا' نو بجے کی شاہراہوں سے گزرتا ہر چوراہے میں ان رفیقوں کی پیشانیوں کو بوسے دے گا اور بغل گیر ہوتے وقت صحیح ٹائمنگ سے لڑکھڑائے گا۔ بازار میں پہنچ کر وہ ہر بقال' ہر آہن گر' ہر جفت ساز کو دیکھ کر سینہ زنی کرے گا پھر ان کے لفظوں پر اعراب لگاتا آگے بڑھ جائے گا۔

صبح کے دس بجنے والے ہوں گے۔۔۔

کہ وہ شہیدوں کے چوک میں پہنچ کر دیو قامت کرونوگراف[1] کے سائے میں دم لے گا اور ٹھیک دس بجے جب کہ کرونوگراف Beeps سنا تا ہوگا' وہ اپنی لنگوٹی سے شیشے کے ٹکڑے نکال کر منہ میں بھر لے گا۔ پھر اپنی' شیشہ چباتی ہوئی آواز[2] میں پکارے گا کہ ہلاکت ہو تم پر ہلاکت ہو۔ اے بے صبر ساعتو اور واویلا مچے اور اے ان ساعتوں میں زندگی کرنے والو تمھارے گھر بے چراغ ٹھیریں اور تمھارے تاکستانوں پر سرخ چونٹیوں کی یلغار ہو کہ وہ غول غول ہو کر آئیں اور تمھارے نخلستانوں کو بادِ سموم جھلس دے اور تمھارے گلے ریگستانی بھیڑیوں کی خوراک بنیں اور تمھاری گابھن اونٹنیوں کے پستان خزاں رسیدہ پتوں کی مانند ختم ہو جائیں۔

لفظ ''پستان'' کو وہ شیشے کے ساتھ چبا چبا کر دیر تک منہ میں گھوتا رہے گا' پھر کہے گا کہ ہلاکت ہو اور تم پر واویلا مچے کہ میں' یوحنا ایلیاہ۔۔۔ آنسوؤں سے بپتسمہ دینے والا' اپنی صلیب کے بوجھ سے کراہتا ہوا آج اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

یہاں وہ کراہ کر دکھائے گا یا آہ بھرے گا' پھر کہے گا کہ:

ہلاکت ہو تم سب پر ہلاکت ہو کہ میرے آیندہ میں تم اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے کس لیے کہ آج کے بعد سے تم چوتھی ڈائمینشن میں زندہ رہو گے۔ واویلا ہو کہ آج میں تمھارے سوگ میں ہوں۔ پھر' جاننے والے' سے کہے گا کہ اے بھائی سن! میرے سر پر تھوڑی خاک ڈال دے کہ میں تو اب ہر موجود کے سوگ میں ہوں۔ تس پہ' جاننے والا' اپنی جیب سے صندل کے برادے کا شیشہ نکال کر چٹکی بھر سفوف اس کے سر پر چھڑکے گا اور کہے گا کہ

---

[1] Chronograph (وقت نگار) وہ آلہ جو واقعات/ حادثات کے ہونے کا صحیح وقت بتائے اور ریکارڈ کرے۔ [2] خود جون کی نظموں سے مستعار لی ہوئی Expression ہے۔

یوحنا! خاک تو فنا بھی ہے اور نمو کا وعدہ بھی اور وہ دو ہتڑ مار کر گریہ وزاری کرے گا۔ پھر نقلی صلیب والا کہے گا 'اے الاسد! تُو دو کوہان کے اونٹ کی طرح بخیل کیوں ہے؟ تیرے رفیق تیرا ماتم کریں' تُو میری چھاتی سے لگ کر بین کیوں نہیں کرتا؟ اور اے 'ایلی پاک دامن!' اے فتنہ قامت! میری پیشانی پر بوسے دینا بند کر دے کہ تیرے لعاب دہن کی ٹھنڈک میرے غصے کی آگ کو کہیں بجھا نہ دے اور 'اے جان برادر!' تُو یہ گریہ وزاری لپیٹ ہی لے اور بھتڑ دریچوں والے گھر[1] کو لوٹ جا کہ آج ہول ناک داستانیں رقم ہونے کا دن ہے۔

سو جان برادر خوشی خوشی گھر لوٹ جائے گا۔

اس وقت دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور وہ سب کے سب سائے میں ٹھہر جائیں گے۔

(وہ لمبی صلیب والا اور اس کے تینوں رفیق سائے میں ٹھہر جائیں گے۔)

(وہ سائے میں ٹھہر جائیں گے۔)

دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے کھدیڑے ہوئے گروہ گروہ گراف کے مہیب سائے سے بچتے' کتراتے ہوئے گزرتے ہوں گے۔ وہ اس کی صلیب کو نخوتے ہوئے گزریں گے' مگر ان کے لیے اس کی آواز کی کمندیں کوتاہ ٹھہریں گی۔ وہ اسے ہونٹ ہلاتے اور جبڑوں کی ہڈیاں کنکناتے ہوئے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز نہیں سُن پائیں گے' سو بڑی بیزاری سے منہ پھیر کر اپنے اپنے مٹھی بھر جَو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گزر جائیں گے۔ ان کو تو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی بد دعائیں اور بشارتیں انھی کے لیے ہیں۔ ان کو جاننے کے اس عذاب سے پناہ ملے گی۔ مگر اس ایک عذاب کے سوا ان کے گروہ' پیٹ کی بھوک اور برہنگی اور شہوت کی چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے سب عذاب سہیں گے۔

---

[1] ۲۴ دریچوں والا گھر' جو گاردان ایسٹ میں تھا' جہاں کبھی جون رہتا تھا۔

اس وقت صبح کے نو بجے ہوں گے۔

سو اس کی آواز کے اسیر اس کے یہ چاروں ہم دم اس کے ہم راہ ہو لیں گے۔ وہ گریہ وزاری کرتا' نو بجے کی شاہراہوں سے گزرتا ہر چو رستے میں ان رفیقوں کی پیشانیوں کو بوسے دے گا اور بغل گیر ہوتے وقت صحیح ٹائمنگ سے لڑکھڑائے گا۔ بازار میں پہنچ کر وہ ہر بقال' ہر آہن گر' ہر جفت ساز کو دیکھ کر سینہ زنی کرے گا پھر ان کے لفظوں پر اعراب لگاتا آگے بڑھ جائے گا۔

صبح کے دس بجنے والے ہوں گے۔۔۔

کہ وہ شہیدوں کے چوک میں پہنچ کر دیو قامت کرونوگراف[1] کے سائے میں دم لے گا اور ٹھیک دس بجے جب کہ کرونوگراف Beeps سناتا ہو گا' وہ اپنی لنگوٹی سے شیشے کے ٹکڑے نکال کر منہ میں بھر لے گا۔ پھر اپنی' شیشہ چباتی ہوئی آواز[2] میں پکارے گا کہ ہلاکت ہو تم پر ہلاکت ہو۔ اے بے مہر ساعتو اور واویلا مچے اور اے ان ساعتوں میں زندگی کرنے والو تمھارے گھر بے چراغ ٹھہریں اور تمھارے تاکستانوں پر سرخ چونٹیوں کی یلغار ہو کہ وہ غول غول ہو کر آئیں اور تمھارے نخلستانوں کو بادِ سموم جھلس دے اور تمھارے گلے ریگستانی بھیڑیوں کی خوراک بنیں اور تمھاری گابھن اونٹنیوں کے پستان خزاں رسیدہ پتوں کی مانند خم ہو جائیں۔

لفظ ''پستان'' کو وہ شیشے کے ساتھ چبا چبا کر دیر تک منہ میں گھولتا رہے گا' پھر کہے گا کہ ہلاکت ہو اور تم پر واویلا مچے کہ میں' یوحنا ایلیاہ۔۔۔ آنسوؤں سے بپتسمہ دینے والا' اپنی صلیب کے بوجھ سے کراہتا ہوا آج اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

یہاں وہ کراہ کر دکھائے گا یا آہ بھرے گا' پھر کہے گا کہ:

ہلاکت ہو تم سب پر ہلاکت ہو کہ میرے آیندہ میں تم اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے کس لیے کہ آج کے بعد سے تم چوتھی ڈائمینشن میں زندہ رہو گے۔ واویلا ہو کہ آج میں تمھارے سوگ میں ہوں۔ پھر جاننے والے سے کہے گا کہ اے بھائی سن! میرے سر پر تھوڑی خاک ڈال دے کہ میں تو اب ہر موجود کے سوگ میں ہوں۔ تس پہ' جاننے والا' اپنی جیب سے صندل کے برادے کا شیشہ نکال کر چٹکی بھر سفوف اس کے سر پر چھڑکے گا اور کہے گا کہ

---

[1] Chronograph (وقت نگار) وہ آلہ جو واقعات/ حادثات کے ہونے کا صحیح وقت بتائے اور ریکارڈ کرے۔ [2] خود جون کی نظموں سے مستعار لی ہوئی Expression ہے۔

یوحنا! خاک تو فنا بھی ہے اور نمو کا وعدہ بھی اور وہ دو ہتڑ مار کر گریہ وزاری کرے گا۔ پھر نقلی صلیب والا کہے گا' اے الاسد! تو وو کوہان کے اونٹ کی طرح بخیل کیوں ہے؟ تیرے رفیق تیرا ماتم کریں' تو میری چھاتی سے لگ کر بین کیوں نہیں کرتا؟ اور اے' ایلی پاک دامن!' اے فتنہ قامت! میری پیشانی پر بوسے دینا بند کر دے کہ تیرے لعاب دہن کی ٹھنڈک میرے غصے کی آگ کو کہیں بُجھا نہ دے اور' اے جان برادر!' تو یہ گریہ وزاری لپیٹ ہی لے اور ہنٹر ور بچوں والے گھر[1] کو لوٹ جا کہ آج ہول ناک داستانیں رقم ہونے کا دن ہے۔

سو جان برادر' خوشی خوشی گھر لوٹ جائے گا۔

اس وقت دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور وہ سب کے سب سائے میں ٹھیر جائیں گے۔

(وہ لمبی صلیب والا اور اس کے تینوں رفیق سائے میں ٹھیر جائیں گے۔)

(وہ سائے میں ٹھیر جائیں گے۔)

دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے کھدیڑے ہوئے گروہ کروفوگراف کے مہیب سائے سے بچتے' کتراتے ہوئے گزرتے ہوں گے۔ وہ اس کی صلیب کو چھوتے ہوئے گزریں گے' مگر ان کے لیے اس کی آواز کی کمندیں کوتاہ ٹھیریں گی۔ وہ اسے ہونٹ ہلاتے اور جبڑوں کی ہڈیاں تلملاتے ہوئے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز نہیں سُن پائیں گے' سو بڑی بیزاری سے منہ پھیر کر اپنے اپنے 'مٹھی بھر جو' سنبھالتے ہوئے تیزی سے گزر جائیں گے۔ ان کو تو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی بد دعائیں اور بشارتیں اُنھی کے لیے ہیں۔ ان کو جاننے کے اس عذاب سے پناہ ملے گی۔ مگر اس ایک عذاب کے سوا ان کے گروہ' پیٹ کی بھوک اور برہنگی اور شہوت کی چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے سب عذاب سہیں گے۔

---

[1] ۴ ے ور بچوں والا گھر' جو کارون ایسٹ میں تھا' جہاں کبھی جون رہتا تھا۔

تو پھر یوں ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی ساری بددعائیں اور تمام بشارتیں بے ہدف بومرینگ[1] کی طرح ہوا میں سنسناتی اور سیٹیاں بجاتی واپس لوٹ آئیں گی اور خود اس پر اور ان پر آن گریں گی جو اس کے قریب سائے میں کھڑے ہوں گے۔

مگر وہ تینوں تو اس کے رفیق ہوں گے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ اس نقلی صلیب والے کی مخبری کردے اور اسے پکڑوا دے۔

ہر چند کہ وہ کفر پہنے ہوگا اور کفر بکتا ہوگا اور کفر سوچتا ہوگا۔

(وہ کفر سوچتا ہوگا۔)

اس وقت وہ اپنی صلیب سے ٹیک لگائے' سر نیہوڑائے سائے میں کھڑا ہوا اپنے دل کی اُمنگ میں سوچتا ہوگا کہ ارے یہ سب کچھ تو ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ ناصرہ کے آسماں شکوہ نجار[2] کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اذیت طلب' اپنے اس خواب کی سرشاری میں لرزتا ہوگا اور سوچتا ہوگا کہ دیکھنا' ابھی میرے انھی رفیقوں میں سے ایک اپنے سائے سے نکل کر ادھر کو جائے گا جہاں صلیب پر چڑھانے والے کھڑے ہیں۔ وہ انھیں بُلا کر لائے گا اور تیسرا پہر شروع ہونے سے پہلے مجھے مضبوط کیلوں سے لکڑی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ مگر اس سے پہلے شاید میرا رفیق' ایلی پاک دامن' تین بار میرے ہونے سے انکار کرے گا اور بعد کو میرا رفیق' جاننے والا' ایک سبز شاخ پر سرکے میں بھیگا ہوا اسفنج رکھ کر مجھے چٹائے گا اور شاید وہ میرا رفیق الاسد ہوگا جو فی الاصل میری مخبری کرے گا اور صلیب پر چڑھانے والوں کو بُلا کر لائے گا۔

''تو اے مخبر۔۔۔ الاسد! میرے یہودا' تجھے جو کچھ کرنا ہے جلد کر لے!''

درشت لہجے اور کرخت چہرے والا الاسد اپنے خیال کی معصومیت میں بڑھ کر اس کے ارغوانی ٹاٹ کو بوسہ دے گا اور کہے گا کہ یوحنا ایلیاؤ! میں تیری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں خیال میں بھی تجھ سے دغا کرنے سے باز رہا تو پھر تُو مجھے یہودا کہہ کر کیوں پکارتا ہے؟

---

1. Boomerang آسٹریلیا کے باشندوں کا قدیم ہتھیار جو پھینکنے والے کے پاس لوٹ آتا ہے۔
2. نوعمری میں جناب یسوع نے بڑھئی کا کام سیکھا تھا۔

تب نقلی صلیب والا جھڑکی کھائے ہوئے بچے کی طرح ایک ایک رفیق کا منہ تکے گا اور سہمی ہوئی کم زور آواز میں پوچھے گا کہ کیا تم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں کہ میری مخبری کر دے اور مجھے صلیب پر چڑھوا دے؟

وہ تینوں باری باری سر ہلا کر انکار کریں گے اور کہیں گے کہ نہیں یوحنا ایلیاہ ہم تیری مخبری نہیں کرنے کے' یہ سن کر وہ دو ہتڑ مارے گا اور ذبح ہوتی بھیڑ کی طرح آواز کرے گا پھر بین کرتا ہوا عظیم چورستے کے تارمیک پر لوٹنیں لگائے گا اور قابو میں نہیں آئے گا۔ ہر چند کہ جاننے والا' روتا ہوا اُس کے ساتھ ساتھ پھرے گا اور الاسد اس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے گا اور ایلی پاک دامن' محبت سے دلاسے دے گا' پھر عاجز ہو کر بیٹھ رہے گا اور جماہیاں لے گا۔

اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہوں گے۔

تین بجے کی Beeps سن کر حد درجہ نڈھال یوحنا رینگتا ہوا دوبارہ کرونوگراف کے سائے میں چلا جائے گا۔ تیسرے پہر کی اُداسی میں اس کا کانٹوں کا تاج مسل مسلا کر بھوسا ہو چکا ہوگا۔ ٹاٹ کا لبادہ نالی میں اس طرح پڑا ہوگا کہ اس کا کچا ارغوانی رنگ گدلے پانی میں بدرنگ لکیریں بنا کر بہتا ہوگا اور بالسا ؤڈ سے تراشی ہوئی اس کی صلیب' منھی منھی بھر جڑ لے جانے والوں کے پیروں تلے آ کر لگدی بن چکی ہوگی۔ بلاشبہ یوحنا ایلیا ؤ یسوع ناصری کے کاسٹیوم کے بغیر جس قدر ننگا ہوگا' اتنا تو وہ پیدا ہوتے وقت بھی نہ تھا۔

تب سسکیاں لیتے ہوئے' جاننے والا' اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا لے گا۔ الاسد اس کے تاج کا بھوسا اور اس کی صلیب کی لگدی پولی تھین کے ایک تھیلے میں بھر لے گا۔' ایلی پاک دامن' نالی میں ہاتھ ڈال کر اس کا ٹاٹ اُٹھا لے گا' اور ٹاٹ سے بدبودار پانی نچوڑتا ہوا سب کے پیچھے پیچھے چل پڑے گا۔

اور وہ لوگ اُسے' جو صبح کو مصلوب ہونے کی اُمنگ میں گھر سے نکلا تھا' شام ہوتے ہوتے بہتر دریچوں والے مکان کے ایک حجرے میں رکھ آئیں گے۔

(وہ اُسے اُس کے حجرے میں رکھ آئیں گے۔)

(اُسے حجرے میں رکھ آئیں گے۔)

''ایادرازا' ایاوپہنا' ایاوژرفا' ایاوبالا۔''[1]

حجرے کی اونچی چھت سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی آواز اسی کے لاغر بدن پر کنکریوں کی طرح گر رہی ہوگی۔ وہ اپنی پسلیوں میں اپنی لانبی نوک دار انگلیاں گڑائے بنکارتا ہوگا کہ تیرے سورج نے تو میرے ساتھ آج بھی دغا کی۔ میں تو خجالت کی گرد میں اٹ گیا کہ یہ سورج بھی رخصت ہوا اور میں زندہ ہوں۔

تُو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا اور مجھے جینے کیوں نہیں دیتا۔ اے میرے دوست! اے میرے دشمن! مجھے جینے دے، مجھے مرنے دے۔ کہ میں جیتا رہوں تو تیرے پہاڑ کا شعلۂ مستعجل میرے بدن سے ایندھن لیتا رہے اور مر جاؤں تو چنان پر پھینکے ہوئے طشت کی طرح تیری صدیاں میری نزع کی چیخ سے جھنجھناتی رہیں کہ الوہی۔ الوہی۔ الوہی۔

تُو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا؟ اور بتاتا کیوں نہیں کہ کیا وہ میرا وہم تھا جو میں جلتی پہاڑی پر اترا تھا اور اپنے الٰہ کی لوحیں اٹھائے بستی میں پہنچا تھا جہاں سب کے سب سونے کے بچھڑے سے جفتی کھاتے تھے اور مجھے اور میرے الٰہ کو پہچانتے نہ تھے؟

تو کیا میں بار برداری کا جانور تھا کہ ان حرام زادوں کی خاطر اپنی جان کو عذاب دیتا رہا؟

تو کیا میں غصہ بھی نہ کروں اور اپنے الٰہ کی لوحیں زمین پر مار کر ٹکڑے بھی نہ کروں؟

تُو مجھے جینے کیوں نہیں دیتا؟ میں تو خیال کی لطافت میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ مگر بلاکت میرے ہونے پر کہ میں نسل کشی کے مہیب اعضا لے کر پیدا ہوا اور اپنے بدن میں رہنے پر مجبور ہوں۔

---

[1] جون ایلیا کی طویل نظم "راموز" سے ایک سطر۔

[اوپر لکھی سطروں میں ہمارا یونہا گویا موسیٰ نبی کی یادداشت کا بھی ہلمان کرتا ہے۔ اسے پھیلاتا ہے۔ مثلاً 'تیرے پہاڑ کا شعلۂ مستعجل' اور 'جلتی پہاڑی' اور 'الٰہ کی لوحیں' اور 'سونے کا بچھڑا' اور 'لوحوں کا زمین پر مار کر ٹکڑے کرنا' یعنی اس طرح ہمارا یونہا سامی ادیان کے دو یا دو سے زیادہ کرداروں کی لیلا دکھا رہا ہے۔]

یہ تُو نے کیسی زندگی میرا مقسوم کی ہے؟ اور السر کی موت اور پیچش اور مینجن جائٹس کی موت میرے لیے کیوں بچا رکھی ہے؟

بلاکت ان آنکھوں پر کہ میں صحرا کی عذاب ناک راتوں میں گھر گیا اور بے ثواب گریہ وزاری کی مشقتیں جھیلتا ہوں۔

واویلا نورِ باطن پر کہ میں چوبِ خشک کی طرح جلتا ہوں اور مجھ سے حرارت اور روشنی لینے والا کوئی نہیں!

''کٹ! شاٹ او کے! کل وائلنس۔ کل دا ساؤنڈ!! (کل ایوری تھنگ)''

''کل ایوری تھنگ! ایوری تھنگ!''

بعل زبوب[1] کے بے شمار سائے تالیاں بجاتے ہوئے اسے اپنے گھیرے میں لے لیں گے اور اس کے ساتھ ٹھٹھول کریں گے۔ وہ اس کے سر پہ چھتریاں ماریں گے اور اس پر تھوکیں گے۔ وہ اپنے ساتھ نئی نے اور جو کی روٹیاں لائے ہوں گے سو وہ اُسے اوندھا گرالیں گے اور اس کے بدن میں روٹیاں داخل کریں گے اور مے کے شیشے اُس پر اُلٹ دیں گے اور اُسے حد درجہ ستائیں گے۔

وہ کھونٹی پر ٹنگے ہوئے شبیہ کی طرح سب کچھ سہتا رہے گا' کہ بدن کی اذیت میں اُسے مزہ ملے گا اور ان باتوں کی پبلسٹی ویلیو ہوگی۔

جب وہ زمین پر پڑا ہوگا تو بعل زبوب کے سائے اس سے پوچھیں گے کہ تُو اُٹھ کر کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟ اور جب وہ دیوار کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوگا تو وہ سوال کریں گے کہ تُو جاتا کہاں ہے' آرام کیوں نہیں کرتا؟ اور وہ اُسے ٹھوکر مار کر گرا دیں گے۔ پھر اُن میں سے ایک یوں کہے گا کہ تُو تو حد درجہ نکما ہے اُٹھ اور خداوندی ہیکل میں جا اور ایک تپائی بچھا کر اپنے سکے پھیلا دے اور کاروبار کر۔

پھر وہ منہ چھپا چھپا کر ہنسیں گے اور آپس میں مشورت کریں گے کہ اس سے اس کے مقدس خریطے چھین لو اور اس کی ژند اور اس کی اوستا پانی میں تر کر کے اس کے حلق میں ٹھونس دو اور کتاب الطواسین سے اس کے ٹخنوں پر ضرب لگاؤ اور شیخ اکبر کو اور اکستین ولی کو اور ملک چین کے دیوزاد کو اس کے قریب نہ آنے دو۔

---

[1] بعل Baal: اشوریوں کا دیوتا اور زبوب Zebu: سانڈ نما دیوتا۔۔۔بعل زبوب: گویا معبودِ باطل۔

وہ ہنستے ہوں گے مگر ان کی ہنسی خوف و دہشت کی ہنسی ہوگی اور ان کا مشغول خود انہی پر رجعت کرے گا اور یوحنا' کہ جس کے بدن پر نوحہ و ماتم اور آہ و فغاں مرقوم ہوگا' وہ اگرچہ ٹوٹے ہوئے برتن کی مانند زمین پر پڑا ہوگا مگر سب دیکھیں گے کہ اس کا چہرہ تو سالم ہے اور اس کی پیشانی آبِ رواں کی طرح لشکارے مارتی ہے اور وہ کلام کرتا ہے۔ اور اپنے پھیپھڑوں کی قوت سے رب الافواج کو پکارتا ہے کہ:

''اے گرج دار آواز والے! تیری آواز بادلوں پر ہے اور تیری آواز میں قدرت و جلال ہے' اور تیری آواز دیوداروں کو توڑ ڈالتی ہے اور آگ کے شعلوں کو چیرتی ہے اور بیابانوں کو ہلا دیتی ہے اور تیری آواز سے ہرنیوں کے حمل گر جاتے ہیں اور تیری آواز جنگلوں کو بے برگ کر دیتی ہے۔'' (عہد نامہ قدیم)

تو اے گرج دار آواز والے! مجھے بھی پکارتے ہوئے سُن کہ میں گونگا نہیں' آواز والا ہوں۔ ہر چند کہ میں نے تیرا رَد لکھا اور تیری نفی کی اور تجھے 'لا' کہا اور تجھ سے سوا اپنی روحِ ناطق کو اپنا الٰہ گردانا اور صبح دم میں پھر ایسا ہی کروں گا کہ اپنے ایقان میں راسخ ہوں اور بے دلی سے ماننے والوں کے اس قرن میں' میں اکیلا انکار کرنے والا ہوں۔

تب ایک عجیب بات رونما ہوگی کہ اس کے حجرے کی چھت بڑی آواز کے ساتھ شق ہو جائے گی اور چھت کے ٹائل اُڑ اُڑ کر دُور دُور تک جا گریں گے اور سورج سنسناتا ہوا اُس کے حجرے میں دَر آئے گا اور اس کی پسلیوں پر آن رُکے گا اور آواز وہ پڑے گا کہ براوو! براوو!

''حنا بی بی[1]' اس کتے کا منہ دُھلا اور اس کے بالوں میں کنگھی کر اور اسے نئی پوشاک پہنا۔''

(پوشاک پہنا)

---

[1] Hanna یہ یوحنا کے صوتی تاثر سے بہرہ مند ایک افسانوی کردار ہے۔

نئی پوشاک پہن کر زوفے کی ایک سبز شاخ ہاتھ میں اُٹھائے وہ اپنے حجرے سے یوں برآمد ہوگا جیسے دن طلوع ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں یہ گمان کرتا آئے گا کہ اب کے شاید اسے زندگی کرنے کی مہلت ملی ہے۔ سو وہ انجیر کے درخت کے نیچے کھجور کے پتوں سے بنا ہوا اپنا سجادہ بچھا دے گا اور نیزے کے قلم کو قط دے کر صندل کے قلم دان پر رکھ دے گا اور مخمل کے بستے کی گرہ ڈھیلی کر دے گا پھر پتھر سے ٹیک لگا کر کھنکارے گا اور 'کوچۂ وزاقاں'[1] کی سمت منھ کر کے پکارے گا کہ قال' قال' یوحنا ایلیاہ۔ تو ننگے پیچاے پہنے' کھجور کے پتوں کی ٹوپیاں اوڑھے' استفسار کرنے والے' گروہ در گروہ اپنی بستیوں سے روانہ ہوں گے۔ ان میں سے بعض اپنے ناقوں پر سوار ہوں گے۔ بعضے اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آئیں گے۔ بعضے پیادہ پا ہی چل پڑیں گے۔

وہ تعداد میں اتنے ہوں گے جتنے نخیلۂ بنی قیدار[2] کے نخل۔ وہ "لبیک یا استاذنا" کہتے ہوئے اس پر ہجوم کریں گے یہاں تک کہ اس کا دم اُلٹنے لگے گا۔ تاہم وہ سجادے سے اُٹھ کر شکر گزاری میں رقص کرے گا۔ پھر پتھر سے ٹیک لگا کر ان کے سوال سننے کو ہمہ تن گوش ہو بیٹھے گا۔

تو ناقوں پر آنے والے اور اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آنے والے اور پیادہ پا آنے والے اس سے غسل جنابت اور حیض اور موئے زیر ناف کے مسائل پوچھیں گے اور یوحنا ایلیاہ یرقان زدہ مریض کی مانند زرد پڑ جائے گا اور مثل کاہ لرزہ کرے گا۔

وہ کم زور آواز میں کہے گا کہ لوگو! میں طاہر نہیں ہوں۔ میں تو تشکیک کا درس دینے بیٹھا تھا۔ تم مجھ سے یہ استفسار کیوں کرتے ہو؟ سنو کہ میں حیض کی بابت کچھ نہیں جانتا اور غسل جنابت کے باب میں منھ نہیں کھول سکتا کہ مباشرت کے بستر سے اُٹھ کر سیدھا سجادے پر آن بیٹھا ہوں اور دیکھو۔۔۔

یہ کہتے ہوئے وہ حیا نا آشنا جھک کر اپنے تہ بند کے گوشے تھام لے گا' پھر انھیں اپنے کانوں کی لوؤں تک پہنچا دے گا اور تا دیر اسی بے ستری میں رقص کرے گا۔

---

[1] ان منقد رسولوں کی گلی جنھوں نے چاندی کے ورق کوٹنے کے آہنگ پر رقص کیا۔

[2] میں نے یہ تحریر کیکل کے دوسرے دن جون کو دکھائی تھی۔ بھائی مجہول اُخفاء میں نے لکھا تھا استفسار کرنے والے بے شمار تھے۔ جون نے کہا اسے یوں لکھو کہ بنی قیدار کے باغ کے درختوں کی طرح بے شمار لوگ تھے۔ میں نے اسی طرح لکھ دیا۔ بہت بعد میں انگریزی لفظ Cedar لغت میں دیکھا۔ ظاہر ہے یہ دیودار یا صنوبر کا نام ہے۔ پر اس لفظ Cedar اور اس 'قیدار' کی صوتی قرابت داری حیران کن ہے۔ یہ اب کس سے کہوں؟ جون تو ہے نہیں! (اسد محمد خاں)

وہ رقص کرتا ہوگا اور آنسوؤں سے روتا ہوگا اور پکار پکار کر اُنگلے بیچارے والوں سے کہے گا کہ "لوگو! تم نے تو میرے کلام کو بے حیثیت ٹھیکریوں کی کھنکھناہٹ سے ملا دیا اور میرے سکوت کو بنجر زمین کی خاموشی بنا دیا اور میرے جاننے کو اپنے نہ جاننے کے برابر سمجھا۔"

"تو لوگو! کیا مجھے اس نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی؟"

(نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی۔)

سو برہنگی اس کا لباس اور خموشی اس کا ورثہ اور چراغ کی لَو اُس کا مسکن قرار پائیں گے۔

اور جو سچ بھی اس نے کمایا، وہ ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ٹھہرے گا۔

اور اس کا جھوٹ سینہ منجنیقوں پر پڑا ودکھتا رہے گا۔۔۔ کہ جب بھی زمین ایک دائرہ مکمل کرے گی، وہ اسے اس کرۂ باد میں اُچھال دیا کریں گی۔

سو یہی اُس کا جینا اور یہی اُس کا مرنا کہلائے گا۔

اور جسے اس نے تلاش کیا اور نہ پایا وہ دوام اب اس کی پلکوں پر آشیانہ کرے گا کہ اس کی پلکیں استوائی سورج کی سفاک برچھیاں ہوں گی۔

اور استوائی سورج کی سفاک برچھیوں پر خداوندی تقدیس اور اس کے سناٹے کا چھتر ہوگا۔

اور ایک سفید پرواز کے نُچے ہوئے پر۔۔۔

اور ایک اندھے کبوتر کی بیٹ پڑی ہوگی۔

رموزِ راموز

پروفیسر سحر انصاری

جون ایلیا ایک منفرد شخصیت اور غیر معمولی خلاقانہ صلاحیتوں سے متصف شاعر تھے۔ جس طرح افلاطون کا خیال تھا کہ اُس کی مثالی ریاست کا سربراہ کسی فلسفی کو ہونا چاہیے اسی طرح جون ایلیا نے بھی اپنی تخلیقی اور فکری سلطنت میں فلسفی اور فلسفے ہی کو اوّلیت کا درجہ دے رکھا تھا۔ حسن پرستی اور رومانی رجحانات کے حامل شعرا جن سے جون ایلیا اوائل عمری سے متاثر رہے اُن میں ابوالعتاہیہ' نابغہ ذبیانی' عرفیؔ' کیٹس اور مجازؔ شامل تھے۔ وہ ان شعرا سے ادبی تاریخ کی نسبتوں سے متعارف تھے اور اپنی عام زندگی میں اُن میں سے ہر ایک کی کوئی نہ کوئی جھلک اپنانے کی طرف مائل رہتے تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر جون ایلیا خود ایک ایسی شخصیت اور شاعری میں ڈھل گئے جسے سماج کی مروجہ اقدار سے مفاہمت نہیں بل کہ مزاحمت میں لطف آتا تھا۔ سبعہ معلقہ کے شعرا خصوصاً امراُالقیس سے اثر پذیری اُس پہ مستزاد تھی۔

اپنے خاندانی ماحول اور تحصیلِ علم کے ابتدائی دور ہی میں جون ایلیا اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی اچھی دست رس حاصل کر چکے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے عبرانی زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی اور اس ضمن میں مولانا ابوالجلال ندوی سے کچھ استفادہ بھی کیا لیکن بات آگے نہیں بڑھی۔ عبرانی سے جون کا شغف یوں تھا کہ اسرائیلیت اور بائبل اُن کے پسندیدہ موضوعات میں شامل تھی اور ان کی خواہش تھی کہ عہد نامہ عتیق تک عبرانی زبان کے ذریعے رسائی حاصل ہو۔

جون ایلیا قصص من التوراۃ سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ بائبل کے واقعات اور انبیا کی آزمائشوں سے بہت متاثر تھے۔ جون ایلیا کو اس امر کا احساس تھا کہ بائبل کا ترجمہ جس زبان میں بھی ہوتا ہے وہ اس زبان میں ایک نئے اسلوب کو متعارف کرا دیتا ہے۔ اُردو میں بائبل کا جو نثری اسلوب شامل ہو چکا ہے اُس کے اوّلین نقوش جون ایلیا کو ابوالکلام آزاد کی تحریروں اور تقریروں میں دکھائی دیے۔ وہ آزاد کے اس اسلوب سے بھی متاثر تھے۔ ان سب کا ماحصل وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے اسرائیلیات کی روایت اور آہنگ میں تخلیق کی ہیں۔ انھی میں ایک موثر نظم ''نئی آگ کا عہد نامہ'' ہے۔ اس طویل نظم کو انھوں نے مختلف حصوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک کے لیے ''لوح'' کی اصطلاح استعمال کی۔ مدت سے انتظار تھا کہ یہ نظم مکمل حالت میں شائع ہو (اس کے کچھ حصے بعض رسائل میں شائع ہو چکے ہیں)۔ سو اب اس امر کی خوشی ہے کہ جون ایلیا کے ایک مقرب اور رفیق کار خالد احمد انصاری نے اس نظم کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کر لیا ہے۔ اس نظم کا عنوان جون ایلیا نے ''راموز'' طے کیا تھا اور اسی نام سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔

ادب میں آگ کا تذکرہ یونانی اساطیر کے سلسلے سے چلتا ہے۔ اس سے وابستہ پہلا نام Prometheus کا ہے جو انسانوں کو حرارت اور روشنی کے رموز سے آگاہ کرنے کے لیے آسمانی دیوتاؤں کی آگ چرا کر روئے زمین پر لے آیا تھا۔ اس جرم کی سزا کے لیے Zeus نے اس کو زنجیروں سے چٹان پر بندھوا دیا تھا اور ایک آہنی منقار والا گدھ اُس کے سینے کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہتا۔ تاایں کہ شام کو یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ سینے کے زخم بھر جاتے لیکن اگلی صبح سے پھر یہی عمل شروع ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس اسطور میں تخلیقی اذہان کے لیے تخلیقی طور پر متاثر ہونے کے خاصے زاویے ہیں۔ مغرب میں تو تقریباً ہر بڑے شاعر نے کسی نہ کسی انداز سے اس علامت کو استعمال کیا ہے لیکن Shelley کی Prometheus Unbound اور Rilke کی Prometheus بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ جون ایلیا بھی اس اسطوری کردار سے متاثر تھے بل کہ جون اپنے جس باطنی کرب اور اذیت کا تذکرہ کرتے تھے

اُس کی مماثلت انھیں Prometheus کی اس کہانی میں نظر آتی تھی۔ آگ جو روشنی، ایجاد، حرارت اور بغاوت کی علامت ہے، جون ایلیا کے تخلیقی رجحان کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ بہ قول جوش ملیح آبادی۔

حکم دیتا ہے خدا، انکار کر دیتی ہے آگ

جون ایلیا کی اس طویل نظم کے کئی حصے ہیں۔ ان میں مضامین اور موضوعات کا تنوع بھی ہے۔ البتہ نظم کا آہنگ، لفظیات، شکوہِ الفاظ اور لہجہ ایک خاص سطح پر نمایاں ہوتا ہے اور شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ اس سے قبل کئی سال پہلے جون ایلیا ''دو آوازیں'' کے عنوان سے اسی آہنگ میں ایک نظم لکھ چکے تھے۔

ہمارے سرکار کہہ رہے تھے یہ لوگ پاگل نہیں تو کیا ہیں

اس نظم میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

سنو کہ فردوسی زمانہ پرکھ چکا ظرف غزنوی کو
جو فکر و فن کو ذلیل کر کے عزیز رکھتا ہے اشرفی کو

''راموز'' کا موضوعاتی کینوس وسیع ہے اور اس میں لفظوں کا استعمال ایک خاص رُخ رکھتا ہے۔ ادبی پیرایے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت Slang کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔

جون ایلیا Non Confirmist تھے اور معاشرے کی اخلاقی اور سماجی قدروں کی مروجہ صورت حال سے نامطمئن بل کہ بغاوت کی حد تک اپنا ایک جداگانہ موقف رکھتے تھے۔ اس نظم میں جہاں تخیل اور لہجے کی ثقاہت ہے وہیں بعض مقامات پر گندِ عفونت اور آدمی کی ریاکاری اور منافقت کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔

جون ایلیا نے انسان کو فرشتہ سمجھا اور نہ شیطان بل کہ یگانہ چنگیزی کی طرح اُس کے یہ دونوں رُخ پیشِ نظر رکھے ہیں۔

شیطان کا شیطان، فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

غور و فکر اور ردِ عمل کی اسی فضا میں جون کی سوچ کے بعض زاویے اس طرح اُبھرتے ہیں۔

اُدھیڑ ڈالو تمام ٹانکے اُدھیڑ ڈالو
کہ اشرفِ خلق کی قبائے وجود یکسر غلط سلی ہے

''سڑے ہوئے پانیوں کے نزدیک آسماں کے ڈھلے ہوئے دھیان سے بہت دُور کیسی بستی میں آ بسے ہو؟''

عظیم تاریخ کے الاؤ پہ زندگی رقص کر رہی ہے
مگر مرے لوگ منجمد رات کے ستاروں کو پوجتے ہیں
عظیم سورج پہ طنز کرتے ہیں اور شراروں کو پوجتے ہیں

جون ایلیا نے خدا' کائنات اور انسان کے مثلث کو کئی نسبتوں سے برتا ہے۔ اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان رشتوں میں پائے جانے والے نقص اور ناانصافی کی بنا پر اشتعال اور غصے میں بھرے ہیں۔ ہر شے کو تہس نہس کر کے از سر نو ایک اپنی مثالی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ مولانا روم کا بھی یہ تصور ہے۔

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

جون ایلیا کے اس غم اور کرب کی ایک جہت بالکل شخصی' ذاتی اور باطنی ہے جب کہ دوسری جہت ملکی مسائل' عالمی ناانصافیوں اور کائنات گیر تخریب کاری اور دہشت گردی کے خلاف ہے۔

''راموز'' ایک انوکھا تجربہ ہے جس کا تذکرہ جدید اُردو شاعری میں ناگزیر ہوتا چلا جائے گا۔ میں اس ضمن میں محتی خالد انصاری کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ وہ مسلسل ''جون شناسی'' کی راہیں استوار کرنے میں منہمک ہیں۔

اظہاریہ

سید ممتاز سعید

ایک روز جون نے بتایا کہ انھوں نے ایک رزمیہ نظم لکھنا شروع کر دی ہے جسے الواح میں تقسیم کر دیا ہے اور انھوں نے پہلی لوح سنائی۔

عظیم تاریخ کے الاؤ پہ زندگی رقص کر رہی ہے

جب وہ اس مصرع پر پہنچے کہ "یہ سرفراز آگ جس کے جوہر جلیل تیشوں میں ڈھل چکے ہیں" تو میں نے بے ساختہ کہا۔ "بھائی جون! اس عظیم نظم کا عنوان 'نئی آگ کا عہد نامہ' ہونا چاہیے" چناں چہ جون اسی نام سے یہ الواح پڑھتے رہے۔ آخری چند برسوں میں انھوں نے اس کا عنوان "راموز" کر دیا تھا۔ زیرِ نظر مجموعے میں اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کا عنوان "راموز" شائع ہو رہا ہے۔

میرے خیال میں اگر جون یہ نظم مکمل کر لیتے تو یہ یقیناً اردو اور دنیا کی عظیم زبانوں کی عظیم ترین نظموں میں شامل ہو جاتی۔ جون کو غزل نے ہائی جیک کر لیا تھا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ غزل اُردو کی حسین دلہن ہے لیکن ساتھ ہی پاؤں کی زنجیر بھی ہے۔

اس مجموعے میں خالد انصاری نے اٹھارہ الواح آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک ہی لڑی کے موتی ہیں۔ اس میں جون کی ساری شاعرانہ صلاحیتوں کا عطر موجود ہے۔ اُن کی عربی، فارسی، عبرانی اور ظاہر ہے کہ اُردو پر قدرت اور پھر عہد نامۂ عتیق کی پیغمبرانہ اور ڈرامائی خطابیہ طرزِ تکلم یہ سارے عناصر اس نظم میں پائے جاتے ہیں۔ بنی نوعِ انسان پر اُن کا غیظ و غضب اور حقارت، اُن کی جنگ جوئی ان مرقعوں میں سبھی کچھ ہے۔ وہ تقریباً الوہی لہجے میں انسانیت کو للکارتے ہیں۔ غرض، جون کے سارے اضطراب اور ہیجان ان الواح کی روح ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جون کو عہد نامۂ عتیق کے ماحول میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ وہ اُس زمانے میں ہوتے تو شاید اُن کے نام کی بھی انجیل ہوتی۔

(جون ایلیا کے عزیز سید ممتاز سعید مرحوم کی جانب سے ایک تحریر۔)

نئی آگ کا عہد نامہ
ایک بھولی بسری یاد

زاہدہ حنا

''رموز'' سے میں واقف نہیں لیکن ''نئی آگ کا عہد نامہ'' کے ساتھ میرے بہت سے برس گزرے ہیں۔ میں نے اس کی پہلی لوح شاید ۱۹۶۳ء میں سنی تھی اور عرصۂ دراز تک اصرار کرتی رہی کہ اس پر اپنی تمام تخلیقی صلاحیتیں صرف کر کے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچانا چاہیے۔ یہی اصرار حسن عابد، راحت سعید، ممتاز سعید اور ضیغم زیدی کا بھی تھا۔ آہستہ آہستہ ہم سب اس بارے میں خاموش ہوتے گئے۔ اس نظم کے ساتھ سب سے بڑا ظلم اسے رقم کرنے والے شاعر نے کیا۔ باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا مزاج میں داخل تھا۔ شاہ نامۂ فردوسی ۶۰ ہزار اشعار پر مشتمل ایک عظیم رزمیہ ہے۔ انھوں نے فردوسی کے ساتھ قدرے رعایت کی اور کہا کہ ''نئی آگ کا عہد نامہ'' ۵۰ ہزار سطروں پر پھیلا ہوا ہوگا۔ ہم سب ان کی باتوں پر پھولے نہ سماتے اور انھیں اکساتے کہ وہ اپنی تمام توجہ اس کی تکمیل پر مرکوز کریں۔

اسی دوران ۱۹۷۱ء کا سانحہ ہوا۔ اس سوگوار رات عبیداللہ علیم نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے ان سے ایک نظم ''استفسار'' لکھوائی ''کیا اس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار ہر شہر تم سے پوچھ رہا ہے جواب دو!'' یہ نظم لوگوں کے دل کو چھو گئی اور انھیں ایک ہیرو کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ وہ عشوہ طراز اور گیسو دراز

حسینائیں جو ان کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتی تھیں اب ان کے آٹو گراف لینے لگیں ان کے ساتھ تصویریں اتروانے لگیں۔ان کی دلچسپیاں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ ''نئی آگ کا عہد نامہ'' طاقِ نسیاں کی زینت ہوا۔ علیم کا کہنا تھا کہ ''وہ اب اس لیے عہد نامے کو یاد نہیں کرنا چاہتا کہ بڑبولے پن میں ۵۰ ہزار سطروں کا دعویٰ کر بیٹھا تھا اب کسی طرح یہ نظم لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائے تو اس کی جان چھوٹے۔'' حسن عابد اور میں علیم کی اس بات پر احتجاج کرتے تو علیم ہمارا بھی مذاق اڑاتے۔

پھر یوں ہوا کہ زمین و آسمان منقلب ہوئے ان کے دوست بدل گئے ''نئی آگ کا عہد نامہ'' یادِ فراموشی کی مچان پر دھر دیا گیا۔کوئی انھیں اس کی یاد دلاتا تو وہ تلملا جاتے' رفتہ رفتہ بات پچاس ہزار سے پانچ ہزار سطروں پر ٹھہری۔درمیان میں یہ واویلا ہوا کہ ہزاروں سطریں چرالی گئی ہیں۔اس ڈاکے کا پرچا کئی قریبی لوگوں کے نام بھی کٹا پھر اس محاذ پر خاموشی چھا گئی۔کچھ دنوں بعد بیان آیا کہ بہت سی الواح کھوئی گئیں۔اب وہ نظم آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی سطریں آپ خود بھی گن سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو الواح انھوں نے لکھیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔یہ جس ترتیب سے لکھی گئی تھیں ان میں مرتب نے یقیناً ردوبدل کیا ہے۔ ترتیب کی یہ تبدیلی کیوں ہوئی' مجھے نہیں معلوم' لیکن اس قدر ضرور جانتی ہوں کہ ''لوحِ جہت'' اس کی آخری لوح نہیں تھی۔

جون نے فلسفے اور شاعری کے ساتھ وقت گزارا تھا۔پاکستان آجانے کے بعد بھی ان کی عالم و فاضل بزرگوں سے ملاقات رہتی' لیکن رفتہ رفتہ ان کے گرد کم علم اور کم فہم لوگوں کا حلقہ ہوا جو ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے اور ان کے ہر جملے پر سر دھنتے۔ پہلے شراب کی نہریں بہیں' پھر سلفے کی آگ بھڑکی۔وہ نوجوان جن کی پشتوں نے فیثا غورث اور انکسا غورث کا نام نہ سنا ہو اور جو اسے کسی حکیم کے نسخے میں لکھی ہوئی دوائیں جانتے ہوں' ان سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی تھی کہ وہ شاعر کے ذہنی سفر میں اس کا ساتھ دے سکیں گے یا اسے کسی بات پر ٹوک سکیں گے۔

''نئی آگ کا عہد نامہ'' سے بہت پہلے فیض صاحب کی نظم ''دو آوازیں'' داد وصول کر رہی تھی۔اس کے برسوں بعد جون نے ''دو آوازیں'' لکھی اور اسے ''رجز'' کا نام دیا۔اسی کے بعد ان کے ذہن میں ایک طویل نظم کا خاکہ ابھرا جسے انھوں نے ''نئی آگ کا عہد نامہ'' کے عنوان سے یاد کیا اور اس کے

ٹکڑوں کو انھوں نے 'الواح' کا نام دیا۔ اس نظم کو 'عہد نامہ' کہنا اس بات کا اشارہ ہے کہ "عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید" کی فضا ان کے شعور اور لاشعور میں سانس لیتی تھی۔ ان کے سامنے یونانی اساطیر کے ان گنت کردار بکھرے ہوئے تھے لیکن "نئی آگ کا عہد نامہ" میں آپ کی ملاقات نہ پرومی تھیس سے ہوگی' نہ ہرقلیطس سے' نہ اکلیز یا ایڈی پس سے' رب الارباب زیوس بھی اس محفل میں موجود نہیں۔

"نئی آگ کا عہد نامہ" اس دور میں سوچا گیا جب اقبال 'مسجد قرطبہ'، 'ذوق و شوق' اور 'ساقی نامہ' ایسی بے مثال نظمیں لکھ کر رخصت ہو چکے تھے۔ ن م راشد' اختر الایمان' جوش ملیح آبادی' علی سردار جعفری' ساحر لدھیانوی کی طویل نظمیں پڑھنے والوں کو اپنا شیدائی بنا رہی تھیں۔ جمیل الدین عالی نے 'انسان' لکھنے کا اعلان کر دیا تھا۔ حسن حمیدی اور کئی دوسرے طویل اور موضوعاتی نظموں پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔

"نئی آگ کا عہد نامہ" کی ابتدائی الواح میں ن م راشد کی جھلک نظر آتی تھی۔ 'حسن کوزہ گر'، 'اسرافیل کی موت' بہ طور خاص 'دل مرے صحرا نورد پیر دل' جس میں راشد نے آگ کا ذکر سو رنگ سے کیا ہے۔ وہ آگ جو پرومی تھیس نے کوہ المپس سے چرائی اور اس نیم حیوان دو پایہ کو دی جس کے لیے دیوتاؤں نے آگ ممنوع کر رکھی تھی۔ اسی جرأت کے سبب پرومی تھیس معتوب و مقہور ٹھہرا اور 30 ہزار برس کی سزا کاٹی۔ اسی نے آگ سے انسان کو آہن گری سکھائی' شکار کے کچے گوشت کو بھون کر کھانے کا سلیقہ عطا کیا' آگ جو اندھیری رات میں اسے بھیڑیوں اور لکڑ بگھوں سے بچاتی تھی' وہ آگ جس نے خاک کے پتلے کو انسان بنایا' اسی آگ سے چراغ جلے اور انسان پر علم و ہنر کے دروازے وا ہوئے۔ آگ جس کی تعظیم کا حق زرتشتیوں نے ادا کیا۔ اسی آگ کے بارے میں راشد نے کہا:

آگ زینہ' آگ رنگوں کا خزینہ
آگ ان لذات کا سرچشمہ ہے
جن سے لیتا ہے غذا' عشاق کے دل کا تپاک

جون کو دل کے تپاک سے غرض نہ تھی۔ مفروضہ محرومیاں ان کے اندر وہ طیش بھڑکاتی تھیں جو انھیں اپنا ہی ڈھانچا چبانے پر اکساتا تھا۔ ان کے کہے کے مطابق وجود میں تشنگی کا وہ تنور دہکتا تھا جسے سرد کرنے کے لیے وہ جوفِ سینہ میں دوزخ انڈیلنے کا دعویٰ کرتے تھے۔

ان کے کٹیلے اور کڑوے لہجے کا سراغ ہمیں عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید میں ملتا ہے۔ بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جنھوں نے اسیری اور دربدری کا عذاب جھیلا' جن کے لوگوں کی گردنوں نے غلامی کے طوق کا بوجھ اُٹھایا' ان کے لیے لکھے جانے والے نوحوں' مرثیوں میں جھلکتا ہوا دشنام و الزام کا عکس' عہد نامہ کی الواح میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے جن لفظیات اور اسالیب کو اختیار کیا' اسے سمجھنے کے لیے عہد نامۂ قدیم و جدید کی شناوری لازم ہے۔

عزیزی صفدر حسین اور خالد انصاری کی کاوشوں سے "رموز" آپ کے سامنے ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جون نے "نئی آگ کا عہد نامہ" کو "رموز" کا نام کیوں دیا۔ اس میں بھی یقیناً کوئی رمز ہوگا۔

کاغذاتِ وجود

خالد احمد انصاری

زندگی میں ہم بہت سے کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں' یہ اور بات ہے کہ کر نہیں پاتے۔ غالبًا ''راموز'' بھی ایسا ہی ایک کام تھا جسے بڑے جذبہ و جوش سے شروع کیا گیا اور ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ خیال تھا' جون اُن تمام تخلیقی کمالات سے بہرہ مند ہیں جو کوئی بھی بڑا ادبی معرکہ سرانجام دے سکیں۔ اُن کے گرد موجود جوہر شناس آرزومند تھے کہ وہ اُردو شاعری میں ایک بڑے کلاسیکی رزمیے کا خلا پُر کریں۔

۹۰ کی دہائی کی اولین ملاقاتوں میں معلوم ہوا کہ جون ایک طویل نظم ''نئی آگ کا عہد نامہ[1]'' گذشتہ تیس برس سے لکھ رہے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ غزل تو وہ محض دل بہلانے کے لیے کہتے ہیں۔ اُن کا اصل کام وہ نظم ہے جو شاذ و نادر ہی کسی کو سناتے ہیں۔ جون کی صرف یہ نظم ہی انھیں امر کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ان بیانات نے مجھے متجسس کر دیا۔ کئی دفعہ اس نظم کے بارے میں خود اُن سے دریافت کیا تو ایک ہی جواب ملا۔ ''ہاں' سنائیں گے۔''

آخری دنوں کے دوران اس نظم کے بارے میں متعدد بار سرسری گفت گو ہوئی۔ کہتے تھے۔ ''میں نے اس نظم میں خدا سے پنجہ لڑایا ہے۔ اس پر مزید کام کرنا ہے لیکن اس پر بوتل چھٹ گئی جس کی وجہ سے بہت کچھ نسیاً منسیا ہو گیا ہے لیکن تُو اور میں مل کر اسے ٹھیک کر لیں گے۔''

---

[1] بعد میں اس نظم کا نام تبدیل کر کے ''راموز'' رکھ دیا گیا۔

جون کی عطا کی ہوئی بیاضوں میں یہ اثاثہ بھی ایک لفافے میں بند ملا۔ بوسیدہ، پھٹے پرانے، بے ترتیب، کہیں کہیں سے دھلے مٹے اوراق کا یہ پلندہ اُن کی اُس اذیت کا غماز تھا، عمر بھر جس کا وہ شکار رہے۔ موجود و ناموجود، جحت و انکار کا تلاطم، ایسا کیوں، ویسا کیوں نہیں؟ تشکیک زدہ ذہن میں جاری رزمیہ، وجود ان کاغذات میں موجود تھا۔ ایک ایک ورق جون کی محنت کا شاہ کار، کئی کئی بار تحریر شدہ، بات نہ بننے کی صورت میں کئی جگہ قطع و برید، تراش خراش۔ دسیوں جگہ ایک ہی لوح اضافی سطروں کے ساتھ موجود تھی۔ ہر لوح ایک الگ داستان تھی، Flashes کے مانند، جھماکے۔ معاملہ اتنا سیدھا نہ تھا، ترتیب ہی خاصی دشوار تھی۔

۲۰۰۷ء میں جون صاحب کے رشتے میں بھانجے، بھائی ثمن (ممتاز سعید) سے ملنا ہوا تو اس نظم کا تذکرہ بھی نکل آیا۔ سُن کر بے چین ہو گئے، کہنے لگے۔ ''مجھے دکھاؤ! شاید میں کچھ مدد کر سکوں'' لیکن سوائے اس کے کہ ''لوحِ رجز'' وہ پہلی لوح ہے جسے جون نے بہ قول اُن کے انھی کی فرمائش پر کہا تھا۔ بھائی ثمن بھی خاطر خواہ مدد نہ کر سکے۔ گذشتہ کئی سال سے لاہور آمد و رفت بڑھی تو سوچا 'الحمد' پر یہ نظم کمپوز کرائی جائے کہ کوئی صورت اسے مرتب کرنے کی نکلے۔ کئی ماہ کی مسلسل تگ و دو سے یہ نظم کتابی صورت اختیار کر گئی۔ کئی صفحوں پر بڑا ابہام تھا، الفاظ پڑھے نہ جاتے تھے جس کے لیے بھائی شکیل عادل زادہ اور عزیزم محمد عرفان سے مدد کے لیے کہا اور مسئلہ کسی حد تک سلجھ گیا۔ مزید تشفی کے لیے اسے اسد محمد خاں، جناب پروفیسر سحر انصاری، عباس تابش، انچ اقبال اور لیاقت علی عاصم کو بھی دکھایا کہ غلطی کا کوئی امکان نہ رہ جائے۔ عربی و فارسی الفاظ کی تحقیق اور درستی کے لیے شعبۂ فارسی کے سربراہ جناب معین نظامی (اورینٹل کالج، لاہور) سے درخواست کی۔ فاضل محترم نے تو کمال کر دیا قاری کی سہولت کے لیے فرہنگ بھی تشکیل دے دی جسے آخری صفحات پر دیا جا رہا ہے۔ محمد عرفان نے مذکورہ فرہنگ میں مزید الفاظ کا اضافہ کیا ادھر جدہ (سعودی عرب) میں مقیم محمد مختار علی نے سرورق نذرِ الواح کی خطاطی کر کے جون ایلیا سے اپنی محبت اور عقیدت کا اس طرح اظہار کیا، اور سید مجتبیٰ حسین کاظمی کا نام نہ لیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ انھوں نے ہر قدم پر میری معاونت کی۔

سب سے بڑھ کے زاہدہ باجی، زاہدہ حنا کا شکریہ۔ انھوں نے تو میرا بھرم رکھ لیا۔

'الواح' کی تصویر کشی، نہایت اہم اور دشوار مرحلہ تھا جسے برادرم دانش رضا نے کمال مہارت سے سرانجام دیا۔ دانش کا فن مصوری، مابعد الطبیعات اور مافوق الفطرت مناظر کا عکاس ہے اور یہ عناصر ان الواح کی تصویر کشی کے لیے ناگزیر خیال کیے گئے۔ یہ لوحیں اپنے مفہوم و خیال کے بطن میں اس قدر پرتیں لیے ہوئے ہیں کہ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا پڑا۔ ان میں سے بعض کے لیے پچاس پچاس اسکیچز بنائے اور رد کیے گئے۔ نئی سوچ اور جذبے کے ساتھ پھر محنت کی گئی، تاہم یقین کامل نہیں کہ حق ادا ہو گیا۔

جون ایلیا 'عہد نامۂ قدیم' کے انداز بیاں سے بہت متاثر تھے۔ اٹھارہ الواح پر مشتمل "راموز" میں اسی انداز کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ الواح ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران لکھی گئیں۔ کچھ الواح 'لوحِ ضرب'، 'الایلئی' اور 'مکاشفہ' جریدے "سیپ" کے شمارہ نمبر ۳۰ اور 'لوحِ دائرہ' جریدے "فنون" کی اشاعت خاص (جولائی، اگست ۱۹۶۶ء) میں شائع ہو چکی ہیں۔ بعض الواح کے نام موجود نہیں تھے جنھیں شکیل عادل زادہ کی مشاورت سے رکھا گیا۔

میرا خیال ہے، وقت جون کو کتنی ہی ارزانی دیتا، یہ نظم اُن کی زندگی میں شاید کبھی شائع نہ ہوتی۔ یہ نظم مکمل نہ سہی مگر مکمل ہے اور یہ جو کچھ ہے، جون زدگاں کے لیے بہت کچھ ہے۔

اسی کو جون ایلیا کہتے ہیں۔

سب اپنے کانوں کو بند رکھیں
گناہ کانوں کے راستے روح میں در آتے ہیں

جو بولتا ہے وہ کرتا نہیں ہے جو سن رہا ہے وہ مشکل میں ہے

دیکھا دور اور پاس جا کر کہ ہار جانے میں ہی خدا نے تقدیر و تدبیر کی رضا ہے

یہ شناسا پراسرار ہے حادثہ ہی مگر کسی کو خبر نہیں ہے

میں رُوحِ اعلیٰ کا نوحہ خواں ہوں
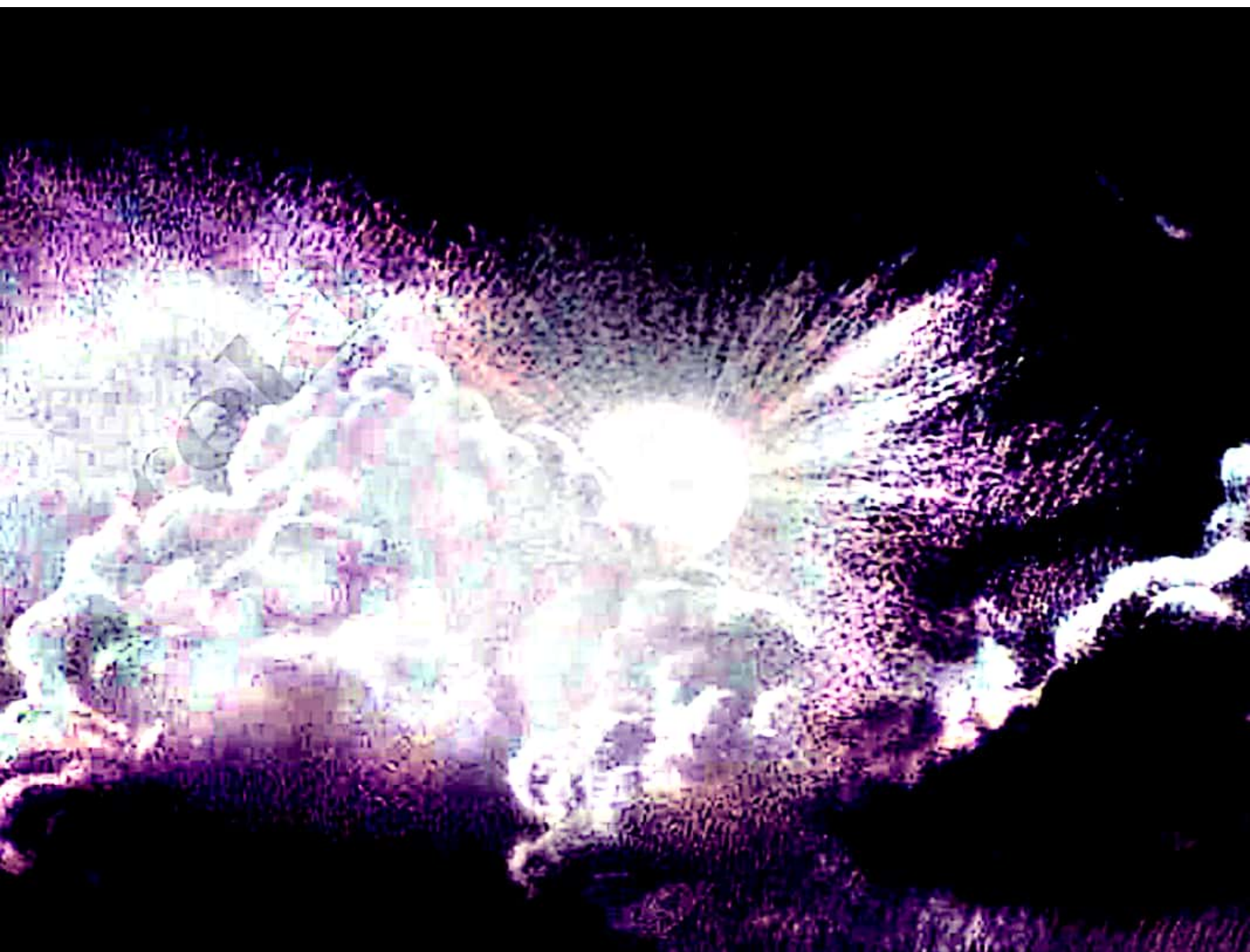
نوحِ کتاب

مجھے قلم دو کہ میں تمھیں اک کتاب لکھ دوں
تمھاری راتوں کے واسطے اپنے خواب لکھ دوں
کتاب جس میں ہدایتیں ہیں
کتاب جس میں تمھارے امراض کی شِفا ہے
مجھے قلم دو
مجھے قلم دو

یہ کون گستاخ میرے نزدیک بیٹھ کر بلبلا رہا ہے
یہ کون بے ہودہ مدّعی ہیں جو مجھ پہ ایزاد کر رہے ہیں
انھیں اُٹھا دو
انھیں اُٹھا دو
میں کہہ رہا ہوں انھیں اُٹھا دو
کہ ان کے انفاس کی عفونت سے میرے مقدس کا رمز
پاکیزہ رمز ناپاک ہو رہا ہے
میں دیکھتا ہوں کہ میری ہیکل کے چند خُدّام اور جارُوب کش
بہ شدّت یہ چاہتے ہیں کہ میں نہ بولوں
یہ چاہتے ہیں کہ میری آواز میرے سینے میں گُھٹ کے رہ جائے
میں نہ بولوں

زنجیریں اٹھا دو
زنجیریں اٹھا دو

نوحِ رجز

دوام! ژولیدہ مُو ہیُولوں کی سرکشی رقص کر رہی ہے
جگر کو خوں کر کے محنتوں کی خود آگہی رقص کر رہی ہے
رجز کے آہنگ پر قبائل کی برہمی رقص کر رہی ہے
عظیم تاریخ کے الاؤ پہ زندگی رقص کر رہی ہے
وہ سرفراز آگ جس کے جوہر جلیل تیشوں میں ڈھل چکے ہیں
وہ ذوالجلال آگ جس کی حدّت سے کتنے پتھر پگھل چکے ہیں
اُس آگ کے تاب ناک فرزند مشعلیں لے کے چل چکے ہیں
مَصافِ تاریخ میں اندھیروں کے اہرمن رُخ بدل چکے ہیں
درخش و تابش کی بیرقیں کوند اُٹھی ہیں یخ بستہ ظلمتوں میں
حیات شعلے پہن کے نکلی ہے زمہریری مَسافتوں میں[1]

---

[1] یہ مصرع جون ایلیا نے نظم کے مسودے میں یوں بھی لکھا ہے۔
''شعور شعلے پہن کے نکلا ہے زمہریری مَسافتوں میں'' (خ۔ا)

جواں قبیلوں کے گلہ بانوں کی آگ آج اپنی حمد خواں ہے
جبالِ حورب کی جھاڑیوں کا وہ آتشیں رمز اب کہاں ہے
عظیم تاریخ کے الاؤ پہ زندگی رقص کر رہی ہے
مگر مرے لوگ منجمد رات کے ستاروں کو پوجتے ہیں
عظیم سورج پہ طنز کرتے ہیں اور شراروں کو پوجتے ہیں
یہ ہیکلِ فتنہ و ہلاکت کے کہنہ کاروں کو پوجتے ہیں
یہ اپنے زخموں پہ لوٹتے ہیں اور اُن کے واروں کو پوجتے ہیں
میں اک قبیلے کو دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں کہ اُن کا احساس مر چکا ہے
حیات کا شعلۂ گرامی نژاد اُن میں ٹھٹھر چکا ہے
ہلاکتوں کا وہ سیلِ قاہر جو کتنی نسلوں کو چَر چکا ہے
جواب دو! کیا وہ سیلِ قاہر تمھارے سَر سے گزر چکا ہے
حیات اک سیل گاہِ قوت ہے اور تم سیل گاہ میں ہو
وہ خود پناہیں نہ پا سکیں گے، تم آج جن کی پناہ میں ہو

Scanned with CamScanner
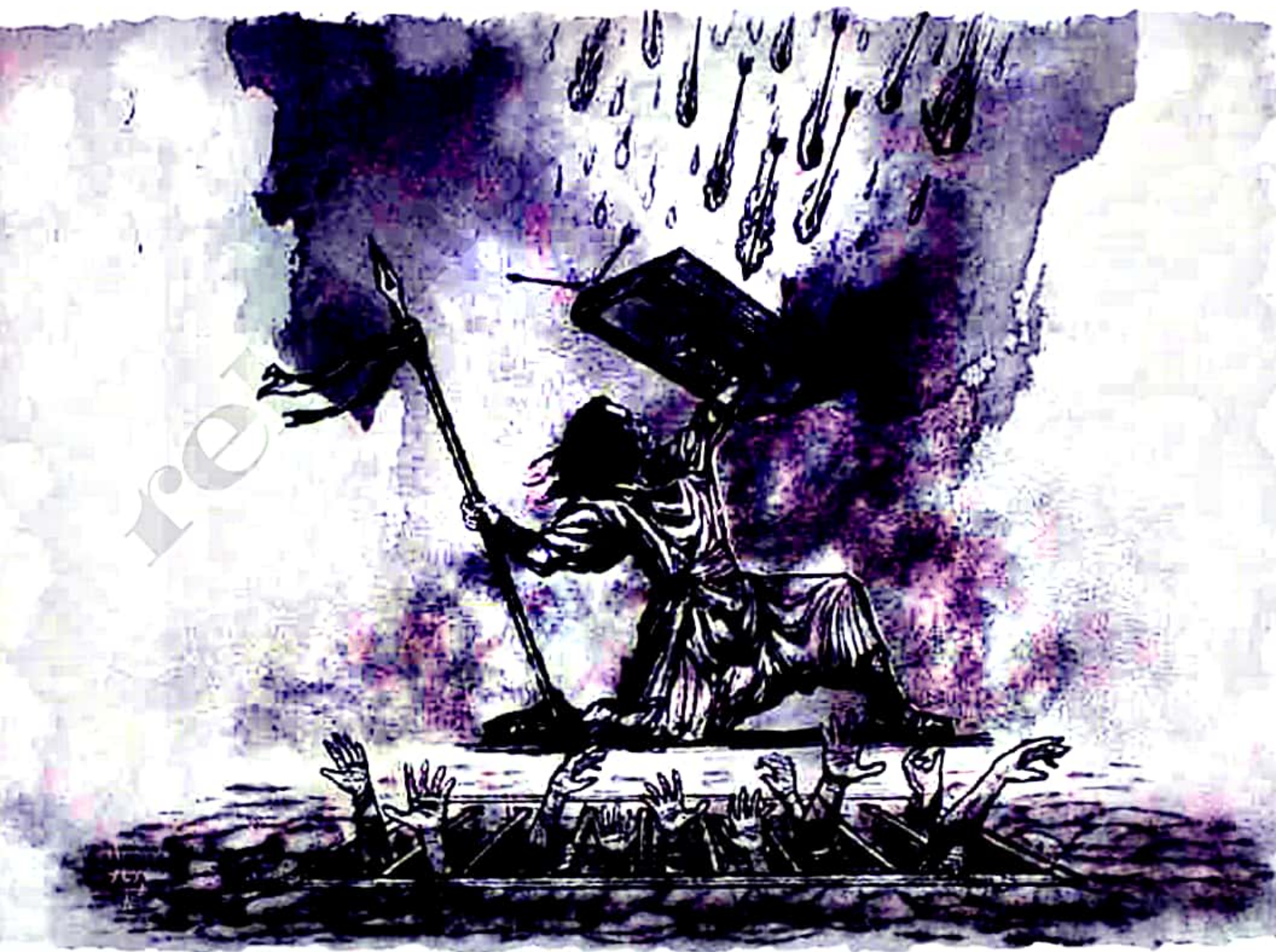
نوحِ آمد

میں آ گیا ہوں، خدا کا بھیدی، تمھاری بستی میں آ گیا ہے
میں آدمی اور خدا کے بیچ اِک بچولیا ہوں
کہا گیا ہے، نہ ہونے والے کو ہونے والوں کے دُکھ نہ سونپو
نہ ہونے والوں کو ہونے والوں سے شرم آتی ہے
کہا گیا ہے کہ میں جو اَب تک کہیں نہیں ہوں اگر ہُوا بھی
تو میں کسی کا خدا نہ ہوں گا

نوحِ خطاب

کانونِ اول کی اس سرمازدہ اور ویران شام کو شعیب چرواہا جب چراگاہ سے اپنی بھیڑیں لے کر پلٹا اور مغربی دروازے سے امارو بستی میں داخل ہوا تو اس کی زبان فساد اُگلنے لگی اور گورستانِ ترازو برداراں کے نزدیک پہنچ کر اس نے چلانا شروع کر دیا۔

"لوگو بستیوں کا ملامت گر آ رہا ہے
گھروں کے دروازے بند کر لو
جحود[1] مجنون آ رہا ہے
جحود مجنون آ رہا ہے
ملامتیں بڑبڑا رہی ہیں، عتاب[2] شیشے چبا رہا ہے

[1] بھائی شمن کا کہنا تھا: "امروہے میں ایک ملنگ کو جوا اکرم کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ عام روش کے مطابق لوگوں کے بچے اُسے چھیڑا کرتے تھے اور مغلظ گالیوں سے نوازتا تھا۔ جون کے ذہن پر یہ نام نقش تھا' وہ جوا اکرم سے بہت متاثر تھے۔ جوا اکرم اُنھی کی طرح کا ایک شخص تھا' آوارہ و دیوانہ دنیا کو ٹھوکر مارتا ہوا اپنی دنیا میں گم ہر ضابطے سے آزاد۔ گمان ہے یہ کوئی اور نہیں اس لوح میں اسی جوا اکرم کو جون ایلیا نے جحود سے موسوم کیا ہے۔" جوا اکرم کا ذکر نظم "سوفسطا" میں بھی ملتا ہے۔
زاہدہ حنا کہتی ہیں: "تقی صاحب کے ہاں کچھ اسی وضع قطع کا "ہدایت" نامی بنگالی باورچی تھا۔ جون اُسے دیکھتے ہی کہتے تھے یہ تو بالکل اپنے جحود کی طرح لگتا ہے۔"
[2] جون نے اس لفظ عتاب کی جگہ "نہیب" اور "خروش" بھی استعمال کیا ہے۔ (خالد احمد انصاری)

ہے کتنی ویران و وحشت انگیز شامِ پائیز
ملال آمیز و حادثہ خیز شامِ پائیز
وہ اپنے آشوب ناک سایوں کو اپنے ہم راہ لا رہا ہے
غضب تو دیکھو' وہ اپنی بستی پہ اپنے زندیق بدزبانوں کو
اپنے ملحد حواریوں کو اور اپنے مجنون شورہ پشتوں کو بے محابا چڑھا کے لایا ہے
غضب تو دیکھو!
وہ آ رہا ہے' وہ آ گیا ہے
گھروں کے دروازے بند کر لو
سب اپنے کانوں کو بند رکھیں
گناہ کانوں کے راستے روح میں در آتے ہیں"

شعیب اپنی بھیڑوں کو ہانکتا اور بولتا ہوا بستی میں مشرق کی طرف بڑھتا گیا اور گھروں کے دروازے بند ہوتے گئے۔ راستے میں اُسے پلاس پوش بوڑھا مرد اس ملا۔ مرد اس نے اُسے بہ شدت جھڑکا اور کہا۔ "او گندہ بغل' فاحشہ کے بیٹے! مخلوق خدا کو آخر کس سے ڈرا رہا ہے؟ کیا اس معصوم اور برگزیدہ جوان سے جو ہماری ہی خاطر مجنون کہلایا جا رہا ہے۔ جو ہمارے ہی لیے اپنا سینہ دکھا رہا ہے۔ خبردار جو اُس صاحب جنونِ الوہی کی شان میں آیندہ کوئی گستاخی کی اور خبردار جو تُو نے جہاں دیدہ بچوں کو کچھ کہا۔" شعیب منہ بگاڑ کر آگے بڑھ گیا اور اُسے بھیڑوں کی گرد نے نگل لیا۔

اُس کے بعد مرد اس ایک کوچے میں داخل ہو گیا اور اُس نے ایک شکستہ دروازے پر جا کر کسی نابینا سماعت کو آواز دی۔ ''الیاس' الیاس! جہاں دیدہ بچے آئے ہیں' جہاں دیدہ بچے آئے ہیں۔''

نابینا سماعت نے اپنی پلکوں کو جلدی جلدی جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ بھی آیا ہے؟''

مرد اس نے جواب دیا۔ ''ہاں وہی تو لایا ہے۔''

کچھ دیر بعد نادیدہ زمینوں اور نایافتہ زمانوں کی ژولیدہ مُو اور بے آرام رُوح 'جحود' صاحب طیلسان اسوز جحود اپنے حروف ہفت گانہ' نوک دار کلاہ کے حلقے میں امارہ وہ کے مغربی دروازے سے بستی کے حاشیے پر نمودار ہوا۔ حروف اُس کے گرد وپیش بین کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ وہ سب نوجوان اور جوان پھٹی ہوئی چادریں لپیٹے ہوئے تھے' قوموں اور قرنوں کے دکھوں نے اُن کے جسموں کو نڈھال کر دیا تھا پر اُن کی روحیں اپنے جنون میں توانا تھیں۔ اُن کے گلوں میں بستے لٹکے ہوئے تھے' بغلوں میں تختیاں دبی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں نرکل کے قلم تھے۔ سرمازدہ شام نے اپنی ویرانی میں اُن کا استقبال کیا۔

وہ آیا اور شام کی ویرانی میں نافذ ہو گیا۔ میدان ترازو برداراں کے وسط میں پہنچ کر وہ اور اُس کے حروف بُرج بیوگان باکرہ کی طرف بڑھے جو چوراہے کے بیچوں بیچ ایک ہفت زینہ چبوترے پر قائم تھا۔ حضرات حروف نے اپنی تختیوں اور بستوں کو چبوترے پر رکھا اور آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ فضا میں زمہریری ہوائیں سنسنا رہی تھیں اور وہ سردی سے کانپ رہے تھے۔ ان کی ایڑھیاں پاش پاش تھیں اور تلوے پارہ پارہ۔ وہ اپنے پیروں میں دشوار گزار مسافتوں کی گرد پہنے ہوئے تھے۔ جحود زمانوں اور زمینوں میں جلتا اور بجھتا ہوا یہاں آیا تھا اور بے درماں غمے اور بے اماں جھنجلاہٹیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ سو اُس نے یہ ساری متاع اس ویران زمہریری فراخنائے میں بکھیر دی۔ قریبی مکانوں کے مکین اُنھیں اپنے دریچوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ جحود چبوترے پر چڑھا اور بُرج کے پہلو سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا اور گہرا سانس لیا' حروف نے اُس کی حرارت کو پہن لیا پھر وہ آواز کا ستونِ آتشیں بن گیا اور وہ آواز یہ ہے۔

ایادرازا' ایاہ پہنا' ایاہ ژرفا' ایاہ بالا
تمام امثال اور اضداد بے ثبوت اور بے حوالہ
سماعتوں کے لیے حوادث کی شام ہے یہ
کہاں ہیں وہ سب کے سب کہاں ہیں؟
کوئی نہیں ہے' کوئی نہیں تھا' کوئی نہ ہوگا
ایادرازا' ایاہ پہنا' ایاہ ژرفا' ایاہ بالا
تمام ارواح اور اشباح بے ثبوت اور بے حوالہ
تخشّن مَسافت پہ ایک پرچھائیں رہ گئی ہے
جو نیستی میں سِسک رہی ہے' گھسٹ رہی ہے
بس ایک پرچھائیں رہ گئی ہے' میں اس کی رانیں کھرچ رہا ہوں
میں اُس کے پستاں چبا رہا ہوں
سو میرے دانتوں میں کرکراہٹ ہے اور مرا خون کھول اُٹھا ہے
میں چاہتا ہوں وجود کی بستیوں کو یک سر تباہ کر دوں

بصارتوں میں وبائیں پھیلی ہیں، رویتوں میں مضرتیں ہیں
رُخِ مرایا سیاہ کر دو
تمھارا مہمان آ گیا ہے
کہاں ہیں یہ سب کے سب کہاں ہیں
یہ کیسے بدبخت میزباں ہیں
خبیث، دیوّث، سب طویلوں میں جا گھسے ہیں
تمھیں قسم ہے جو اَب کبھی تم وہاں سے باہر قدم نکالو
کواڑ تک بند کر لیے ہیں
میں کہہ رہا ہوں تمام دروازے اپنے گھٹنوں پہ چل کے آئیں
جو مجھ کو گھورے گا اُس کی آنکھیں نہ پھوڑ ڈالوں گا
سو اے عدیمو! دلیل دو اور ہار جاؤ
کہ ہار جانے میں ہی تمھارے خدائے قدّوس کی رضا ہے
فانّا مستقبلون أمراً له، وجوهٌ ولی وجوهٌ

جحود اک ایسے امر سے گتھ گیا ہے جس کے ہزار رُخ ہیں
جحود کے خود ہزار رُخ ہیں
سو ایک میں ہوں
میں جہلِ اعلیٰ کا مدعی ہوں
میں جاننے اور نہ جاننے کے تمام اعراض سے بری ہوں
مگر یہ مجھ سے کبھی نہ ہو گا کہ میں وہ پُرخاش بھول جاؤں
جو میرے اور میرے جہلِ اعلیٰ کے درمیاں دُھول اُڑا رہی ہے
میں پوچھتا ہوں یہی وہ عالم ہے؟
میں پوچھتا ہوں یہی وہ آدم ہے جو ثبوتِ وجودِ باری میں پیش ہو گا
نژادِ آدم یہ مت سمجھنا کہ تیرے نساب بے خبر ہیں
تُو آب گندہ ہے جس کو مجہول شہوتوں نے جھٹک دیا ہے
میں تیرے مابین عطرِ منشم چھڑک کے جاؤں گا اور دیکھوں گا
کون تیرا حفیظ ہو گا

دریدنی ہا، بریدنی ہا، شکستنی ہا، گزشتنی ہا
میں چاہتا ہوں تمام ٹانکے اُدھیڑ ڈالوں
کہ اشرفِ خلق کی قبائے وجود یک سر غلط سِلی ہے
نژادِ آدم، یہ تیری دوپایگی ہنساتے ہنساتے مجھ کو ہلاک کر دے گی
میں جو بھی سوچوں گا وہ کہوں گا اور اس کی پوری سزا سہوں گا
میں روحِ اعلیٰ کا نوحہ خواں ہوں کہ جس کو ہونا تھا اور نہیں ہے
میں پوچھتا ہوں وہ کیوں نہیں ہے!
نژادِ آدم، تری مصیبت کا کیا ٹھکانا
تجھے یہ سہنا پڑا کہ روحِ وجودِ اعلیٰ کہیں نہیں ہے
برہنگی ہی برہنگی ہے، حجابِ اقصیٰ کہیں نہیں ہے
فقط ترا بوجھ ہے جو تجھ سے ہے اور تجھ پر ہے اور سہارا کہیں نہیں ہے
تری مصیبت کا کیا ٹھکانا ہے
مگر مرا ذہن۔۔۔؟ جو اذیت وہ سہہ رہا ہے

مگر مرا نفس، جو ندامت وہ سہہ رہا ہے
وہ اس مصیبت سے کم نہیں ہے
تری مشقت سے کم نہیں ہے
میں جاننے اور نہ جاننے کے تمام اعراض سے بری ہوں
میں جہلِ اعلیٰ کا مدّعی ہوں
اور اس پہ دعوا بھی کر رہا ہوں
پھر ایک دعوا اور اس کے بعد ایک اور دعوا
میں ایک کے بعد دوسرے اِدّعا کی شہوت میں مبتلا ہوں
سو، کاش میں ایسے دو مرکّب ہی بول سکتا
میں ذہن میں ایسے دو ہی جملوں کو تول سکتا
جو میرے حق میں مری ہلاکت سے سو گنا قہرناک ہوتے
مگر تناقض سے پاک ہوتے
میں پوچھتا ہوں کہ میں وہ آدم ہوں

جو ثبوتِ وجودِ باری میں پیش ہو گا؟
یہ میری دوپائیگی ہنساتے ہنساتے مجھ کو ہلاک کر دے گی
یہ کیا دریچوں سے جھانکتے ہو
حقیر کیڑو، غذا بھی کھائی کہ صرف روحوں کی حمد گائی؟
یہ ایک نر ہے اور ایک مادہ
یہ ایک نر ہے، یہ ریچھنی اس کے عقب میں ہے
ہزار خصمی نے اپنے بھٹ سے فرار ہو کے اب ایک نرے کو چُن لیا ہے
گناہ گارِ ازل ہیں دونوں
نہ جانے کس نقصِ آفرینش کا نقشِ رد و بدل ہیں دونوں
گناہ گارِ ازل، سرین و سمک چھپائے ہوئے کھڑے ہیں
اور ان کی باچھیں کھلی ہوئی ہیں
یہ میری تضحیک ہو رہی ہے
یہ ہنس رہے ہیں کہ رو رہے ہیں

یہ فیصلہ مکھیاں کریں گی' یہ فیصلہ مکڑیاں کریں گی
یہ اپنے بارے میں خود ہی ہر بات کہنے والا
اور اس پہ نادم نہ ہونے والا
عجیب تر ہے
یہ اپنی آنکھوں سے اپنا پیشاب رونے والا
غریب تر ہے
شکم میں فضلہ بھرا ہوا ہے مگر یہ مبرز کو دھو رہا ہے
یہ اپنے مبرز کو دھونے والا عجیب تر ہے' غریب تر ہے
سقیطِ نسناس میری نظروں سے دُور ہو جا
میری نظروں سے دُور ہو جا
خدا وہی ہے' وہی ہے جو اس وجودِ ناقص کی بستیوں کو تباہ کر دے
رُخِ سراپا سیاہ کر دے
عدم کو اس کا گواہ کر دے

عدم میں اک رمز ہے جو صُلبِ وجود و رحمِ جنا سے بھی چھپا ہوا ہے

وہ رمز کیا ہے؟ وہ رمز کیا ہے؟ جحود کیڑے وہ رمز کیا ہے

جحود کیڑا تو جہلِ اعلیٰ کا مدّعی ہے

جحود کیڑا تو جاننے اور نہ جاننے کے تمام اعراض سے بری ہے

ایادرازا، ایاہ پہنا، ایاہ ژرفا، ایاہ بالا

تمام امثال اور اضداد بے ثبوت اور بے حوالہ

نہ کہنے والا، نہ سننے والا

ایاہ ژرفا، ایاہ بالا

(پھر جحود سکوت میں کائن و متکون ہو گیا، تب حروف کلام سے متمسک ہوئے اور ختمِ بیان و بلاغ کا ترقیمہ پڑھا۔)

جحود صدیوں میں جینے والا، جحود لمحوں میں مرنے والا

ایاہ ژرفا، ایاہ بالا

مُکاشفہ

پناہ مانگو، پناہ مانگو!

فاصلے بے درنگ فتنوں سے نام زد کر دیے گئے ہیں

زمین کے حاشیے زمینی بلاؤں سے بھر دیے گئے ہیں

تمام صدیوں کے جرم اپنی سزا کو پہنچیں گے

دادخواہوں کے داعیے انتہا کو پہنچیں گے

سفید روحوں نے اور میں نے

تمھاری راتوں کے فیصلوں پر نگاہ ڈالی

ہراس، تاریکیوں کے گنبد میں قہقہوں کے مہیب کوندے اُگل رہا تھا

ہمارے رخسار تر بتر تھے
سفید روحوں نے اور میں نے
وقت کی خوں گرفتہ رُوحوں کا غم منایا
ہماری پر چھائیاں بغل گیر ہو کے فریاد کر رہی تھیں
''اَیاہ حزناہ واحزیناہ''
ہماری پرچھائیوں کے مابین ایک آواز اپنے قامت کے اُسطوانے
پہ شعلہ زن تھی
''میری نفرت کا رنگ نامہرباں ہے
اور اس کے حاشیے سُرخ اور گہری سیاہ سمتوں میں پھیلتے ہیں
میں اُن کی آبادیوں پہ جھپٹوں گی
اُن کے محلوں کو چاب جاؤں گی
اُن کی راہوں کو ساری سمتوں سے کاٹ دوں گی
مرے عقب میں دریدہ ملبوس دادخواہوں کا سیلِ سیّال آ رہا ہے''

لوحِ دائرہ

میں دائرے پر پڑا ہوا اپنے خوں کے دھبوں کو چاٹتا ہوں
کہ میرے ہونے کا سارا الزام میرے سر ہے
لبوں کی دہلیز پر مری رُوح کب سے فریاد کر رہی ہے
میں اپنے سینے میں جَل رہا ہوں، میں اپنی آنکھوں میں بُجھ رہا ہوں
یہ شاہ راہوں کا حادثہ ہے مگر کسی کو خبر نہیں ہے
مجھے بچالو، مجھے بچالو
ہجومِ آدم جواب دے! کیا یہ کوئی صحرا ہے، شہر کی رہ گزر نہیں ہے؟

میں پھر نہ آؤں گا' میری آواز پھر نہ آئے گی

میرا اثبات پھر نہ ٹکرائے گا تمھاری بطالتوں سے

مگر مرا بال بال مقروض ہے مرے جبرِ آگہی کا

میں اپنی آواز کا بدن ہوں

جو چُپ ہے اُس کی زبان اُس کے دہن میں سڑ جائے گی

میں بولوں گا اور مرا بولنا ہی میرا زیاں بھی ٹھیرے گا

میرے سینے میں جو خراشیں سُلگ رہی ہیں

وہ آخرِ کار میری لوحِ مزار کا حاشیہ بنیں گی

جواب کی بستیوں کے دروازے بند ہیں اور مرا گلا خشک ہو چکا ہے

تمام انسان اپنی پرچھائیوں کو اوڑھے ہوئے ہیں اور شام بہہ رہی ہے

دُھند نے چوک کے بڑے بُرج کا مثلث نگل لیا ہے

سکوت کا زمہریر سمتوں میں گُھل چکا ہے

میں ایک سنگیں مجسمہ ہوں جسے بنا کر، جسے خیاباں میں نصب کر کے
مجسمہ ساز اور معمار اپنا روزینہ پا چکے ہیں
میں ایک سنگیں مجسمہ ہوں
جو دُھند کی طیلسان اوڑھے ہوئے ہیُولوں کو تک رہا ہے
مگر ساعت کا جال اب جلد بُن لیا جائے
سُن لیا جائے
میرے اطراف ایک طوفان اُٹھنے والا ہے
جو زمینوں کو یوں نگل لے گا
جیسے یہ لوگ اپنے لوگوں کا خونِ بستہ نگل رہے ہیں
زمین جب اپنی گردشوں کا حساب دے گی تو میں کہوں گا
خدا کے لوگوں نے میرے لوگوں کا خون پی کر نجات پائی
میں اپنے سینے میں جل رہا ہوں، میں اپنی آنکھوں میں بجھ رہا ہوں

O

خون پینے دو مجھے، خون۔۔۔
گرم و گندم گوں جواں رانوں کا خون
نرم و نازک گول پستانوں کا خون
ہیں بہم پیوستہ تیری گندمی رانوں کے لب
اُن لبوں کو اِک شگافِ آتشیں درکار ہے
خون پینے دو۔۔۔خون۔۔۔

O

خون پینے دو مجھے، خون۔۔۔
گرم و گندم گوں جواں رانوں کا خون
نرم و نازک گول پستانوں کا خون
ہیں بہم پیوستہ تیری گندمی رانوں کے لب
اُن لبوں کو اِک شگافِ آتشیں درکار ہے
خون پینے دو۔۔۔خون۔۔۔

میں اک شخص مجسم ہوں
جسے تم نے خیابوں میں نصب کر کے
مجسمہ ساز اور تماشائی اپنا روزینہ پا چکے ہیں
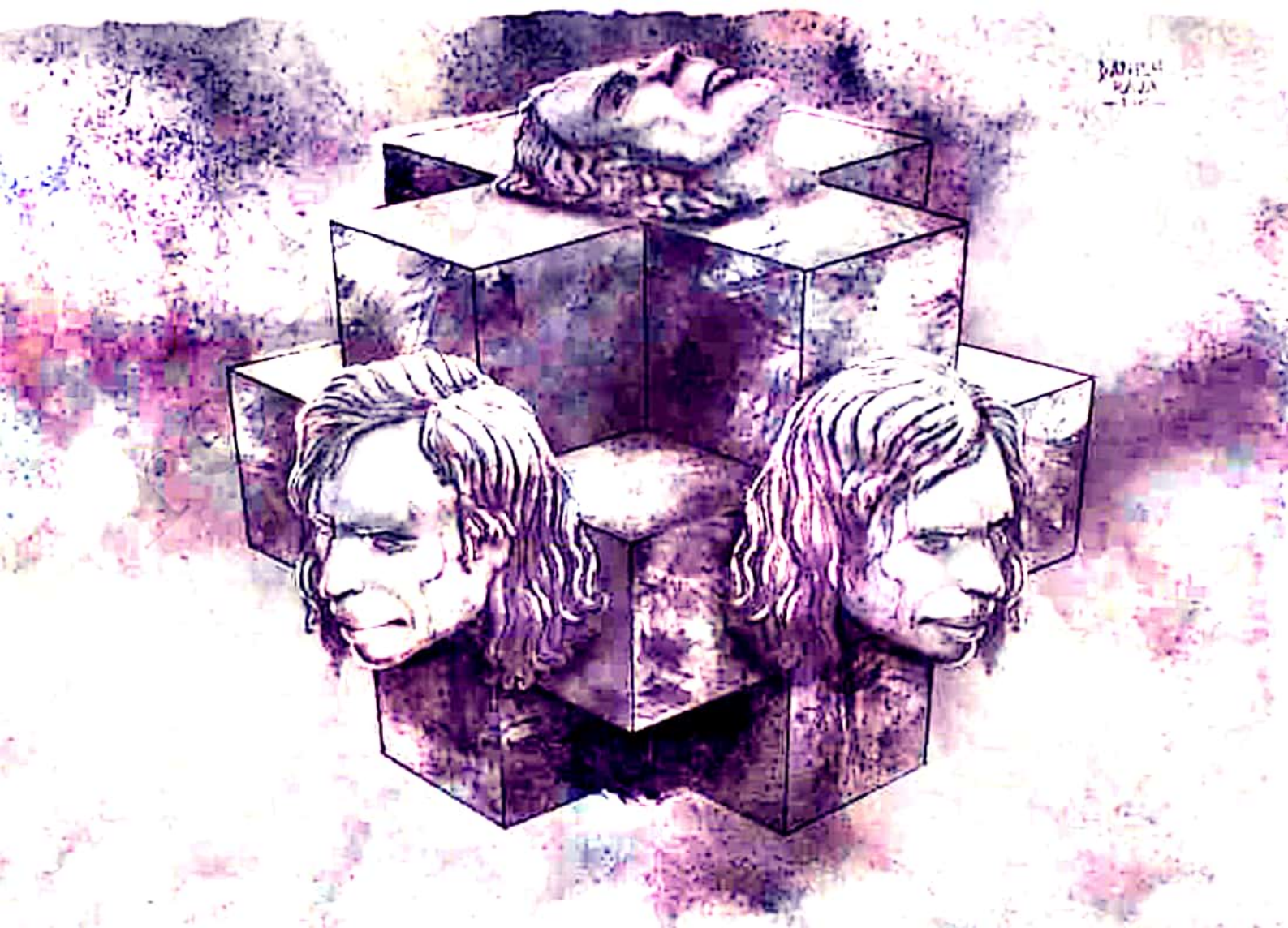
نوحِ ضرب

اور میں اپنے چھے (۶) میں نگاہوں کی روزی کماتے ہوئے تھک گیا
اور میں حرف تھا' حرف' قامت پہنتے ہی' چھونے کی' چکھنے کی اور
دیکھنے اور سننے کی اور سونگھنے کی وباؤں میں ریشوں تلک چھک گیا
میرے چھے (۶) میں سے جو بھی چھٹا تھا وہ پانچوں کے پانچوں کا انکار تھا
اور ان میں سے جو بھی تھا وہ اپنی باری میں بس اپنا اقرار تھا
میں تو بس ایک گنتی کی تکرار تھا
ایک گنتی کی تکرار ہے' جس میں ہونے کا ہر گوشوارہ قلم بند ہے
اور نہ ہونے کا ہر گوشوارہ تو وہ چند ہے

میری دائیں طرف ایک پھیلاؤ ہے، میری بائیں طرف ایک پھیلاؤ ہے
ایک پھیلاؤ پیچھے ہے، اِک سامنے
ایک پھیلاؤ اُوپر سے اُوپر تلک، ایک پھیلاؤ نیچے کے پھیلاؤ تک
مجھ کو لکھا گیا ایک پھیلاؤ میں
اور پھر میرے وَرقوں کا شیرازہ باندھا گیا ایک اندھیاؤ میں
اور میں اپنے لمحوں کے اندھیاؤ میں، اپنے بکھراؤ میں
اپنے ہی 'میں' پہ اپنے ہی پتھراؤ میں ریزہ ریزہ ہوں
تُو جو 'میں' ہے، سو تُو کون ہے؟
تُو جو 'تُو' ہے، سو میں کون ہوں؟
کون ہے جس کا 'میں' ڈھول ہے؟ کون ہے جس کا 'تُو' ڈھند ہے؟
ڈھول اور ڈھند اور دہر کا سارا آہنگ اِس پَل کہیں ہے
تُو اُس ایک مِردنگ میں ہے
جو میری ہتھیلی کے شفاف چُھونے میں پھیلا ہوا ہے
مری میز میں ہے

ہاں وہ چوکور شفاف کے ریز ہاریز میں ہے، جو مجھ سے بھی بڑھ کر
اکیلا ہے اور جس کی ویران بے مژہ آنکھوں کا سب سے انیلا، سجیلا
کوئی خواب ہے تو وہ میں ہوں
تو وہ میں ہوں جو اپنی ہی اِک میز کا خواب ہے؟
میز جو اپنے سینے پہ شیشہ سجائے شعاعوں کو پرچا رہی ہے
تو اِک خواب ہوں میں اور اس ڈوبتے دن کی اِس میز کا
اور اِس پر جو رکھی ہوئی ہیں
اُن آنکھوں کا اِک خواب ہوں میں
ایک اور چار، پانچوں کا اِک خواب ہوں میں
خواب اپنی نگاہوں کی روزی کماتے ہوئے تھک گئے ہیں
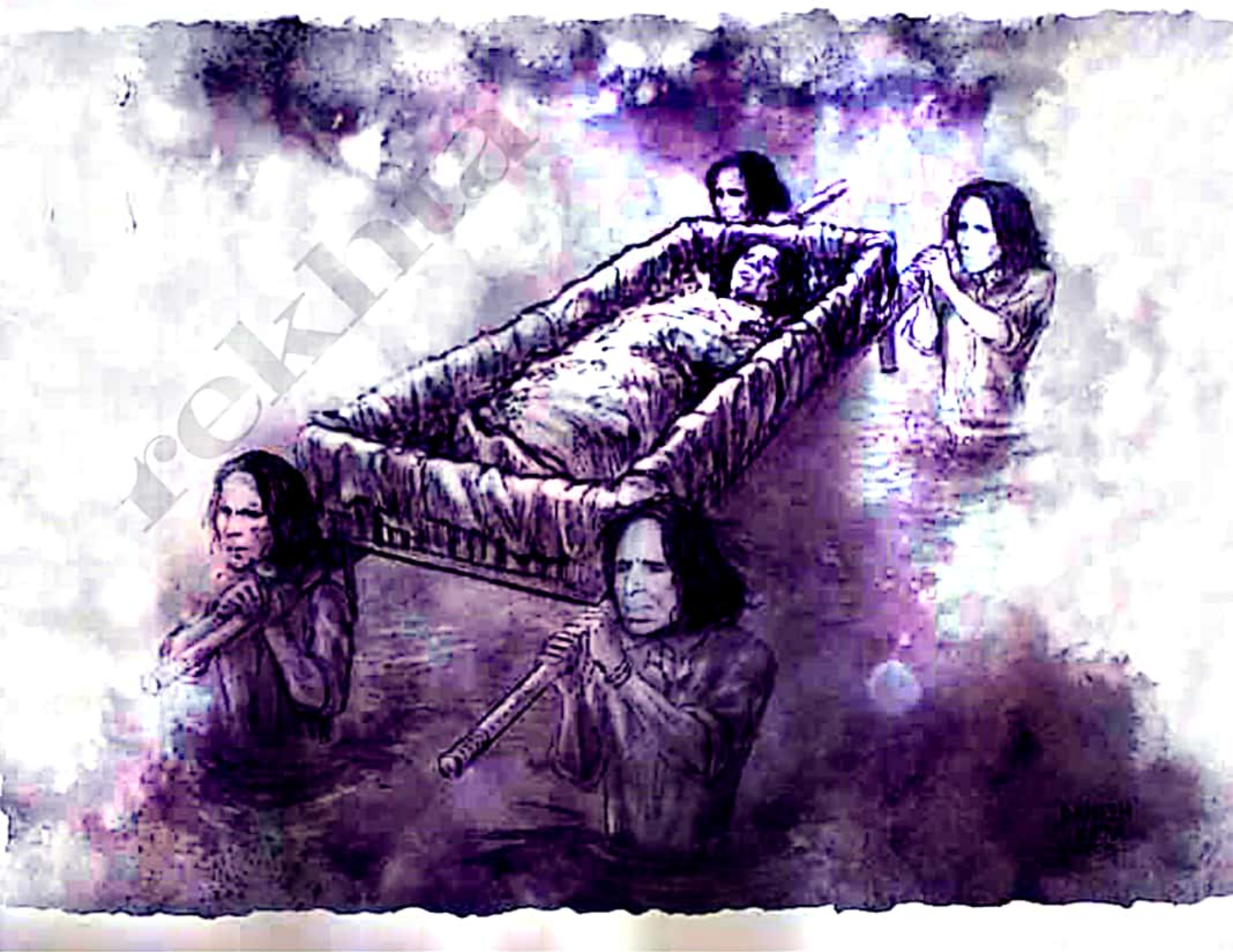
اَلاَیَلَلی

مرے اِدھر ہی نہیں اُدھر بھی، مرے وَرے ہی نہیں پرے بھی
جو دیکھنے اور دکھائی دینے میں ہے (وہ جو بھی ہے) میرا قاتل ہے
اور میں ہوں جو ہر طرف قتل ہو رہا ہے
میں اپنے چاروں طرف سے کتنی ہی اپنی لاشوں کا ایک انبوہ سہ رہا ہوں
میں اپنے بیروں کے اندروں میں نڈھال ہوں اور ڈھے رہا ہوں
مرے جنازے اُٹھائے جاتے ہیں، میرے کاندھوں پہ لائے جاتے ہیں
کہاں کہاں دفن ہو رہا ہوں

ہزار لاشوں کا اِک جنازہ، کہاں کہاں دفن ہو رہا ہے
یہ مرنے والے عجب ہی کچھ تھے (یہ مرنے والے)
اَلا یَلِلّی، اَلا یَلِلّی
میں اپنے ہر دفن سے، کفن سے، وجود کا اِک نیا بہانہ اُچک رہا ہوں
(یہ مرنے والا عجب ہی کچھ ہے)
مجھے مری ریزہ ریزہ لاشوں سے نو بہ نو کالبُد ملے ہیں
یہ سب کے سب جا چکیں تو میں اپنی قبر کھودوں
کہ قبر میری بجز مرے اور کون کھودے گا؟
چلے گئے سب، یہ مرنے والے چلے گئے سب؟
تو، لے میں اب اپنی قبر کھودوں
اور اپنی لاش اپنے آپ میں۔۔۔ اپنے زندہ سینے میں دفن کر دوں
میں مَر چکا ہوں، میں جی اُٹھا ہوں
اَلا یَلِلّی، اَلا یَلِلّی

میں اپنے چاروں طرف سے اکٹھی کی اپنی لاشوں کا ڈھیر لیے کھڑا ہوں
میں اپنے بیرون سے اندرون میں نڈھال ہوں اور دیکھ رہا ہوں
میرے جنازے اٹھائے جاتے ہیں میرے کاندھوں پہ لائے جاتے ہیں

نوحِ مُسافت

تھکا ہوا ہوں میں، اُس کنارے سے اِس کنارے تلک
بہت ہی تھکا ہوا ہوں
طرف طرف روشنی کی بینائی کی مُسافت ہے اور تھکن ہے
تھکن مُسافت کا نشّہ ہے اور میں نشّے میں چھلک رہا ہوں
خلاؤں میں روشنی میں بینائی اپنی پلکوں پہ رو رہی ہے
اب اُس کی آنکھوں میں دُھند ہے اور دُھند چشمہ لگا رہی ہے
اور اپنا اندازہ کھو رہی ہے
تھکا ہوا ہوں میں، اُس کنارے سے اِس کنارے تلک
بہت ہی تھکا ہوا ہوں

مَسافتوں کا حساب جانچا گیا تو ذرّے کے ایک ریزے نے
مجھ سے جو کچھ کہا وہ آپس کی بات ہے
جو کسی سے کہنی نہیں ہے مجھ کو
مَسافتوں کا حساب ریزے کا اپنا ذاتی معاملہ ہے
وجود کی رات کہکشانوں سے کہکشانوں تلک بچھی ہے
میں وقت کی گرد کا نوشتہ ہوں
وہ نوشتہ جو گرد کی گردباد ہی پر لکھا گیا ہے
میں وہ نوشتہ ہوں جو یہاں گم شدہ نگاہوں کی دُھند ہی میں پڑھا گیا ہے

کھلی دن ایک تماشہ ہے اور میں اپنے میں جو کچھ تھا ہوں

دن میں زندگی کی بنیادی اپنی نگاہوں سے اوجھل کر رہا ہے

ہر بار اپنی شکایتوں میں دھندلا ہے اور دھند پرچھائیں گیا ہے اور

اپنا زاویہ کھو رہا ہے۔
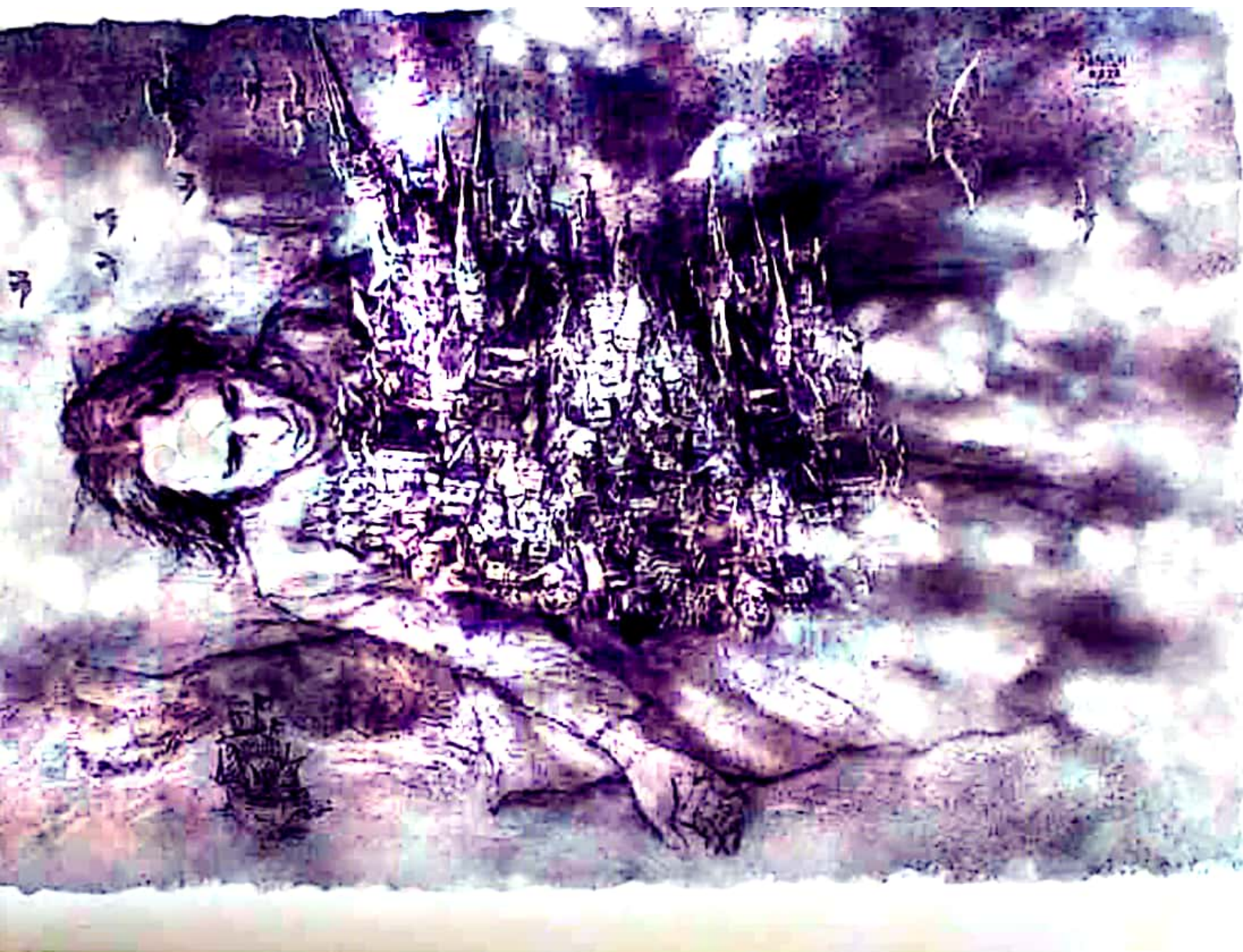
لوحِ وجود

میں سو رہا تھا، میں جوں ہی جاگا اور آنکھ کھولی تو دیکھتا ہوں
کہ میرے سینے پہ شہر تعمیر ہو چکا ہے
مرے بدن میں اِدھر اُدھر آہنیں سلاخیں گڑی ہوئی ہیں
کہ مجھ میں شہتیر نصب ہیں جو بلند ہوتے چلے گئے ہیں
میرے ہاتھوں، ہتھیلیوں اور سارے ڈھانچے پہ اینٹ پتھر پڑا ہوا ہے
اور اس پہ روڑا اٹا ہوا ہے
اور اس پہ قیر و کزف کی تہ ہے
پھر اس پہ سنگیں پرت جما ہے کہ جس میں قیر و کزف کے ٹانکے
لگے ہوئے ہیں

یہ کوی و برزن کے سلسلے ہیں جو پھیلتے ہی چلے گئے ہیں
بہم فشار آوری کا ازہم گسستہ غوغا مری سماعت پہ یاں سے پیہم
شدید پتھراؤ کر رہا ہے
شکستہ ڈھانچوں کے ٹُن ٹُنے سائے اپنے کاندھوں پہ نیلے دھبّوں کا بوجھ اُٹھائے
سیاہ جھونجل میں ٹُن ٹُناتے، خبیث مخروط پوش ٹُھگروں کے آگے پیچھے
گھسٹ رہے ہیں
یہ زندہ بنیاد شہر ہے اور میں اس کے نیچے دبا پڑا ہوں
وہ کون ہے جو مجھے نکالے
وہ کون ہے جو مجھے نکالے
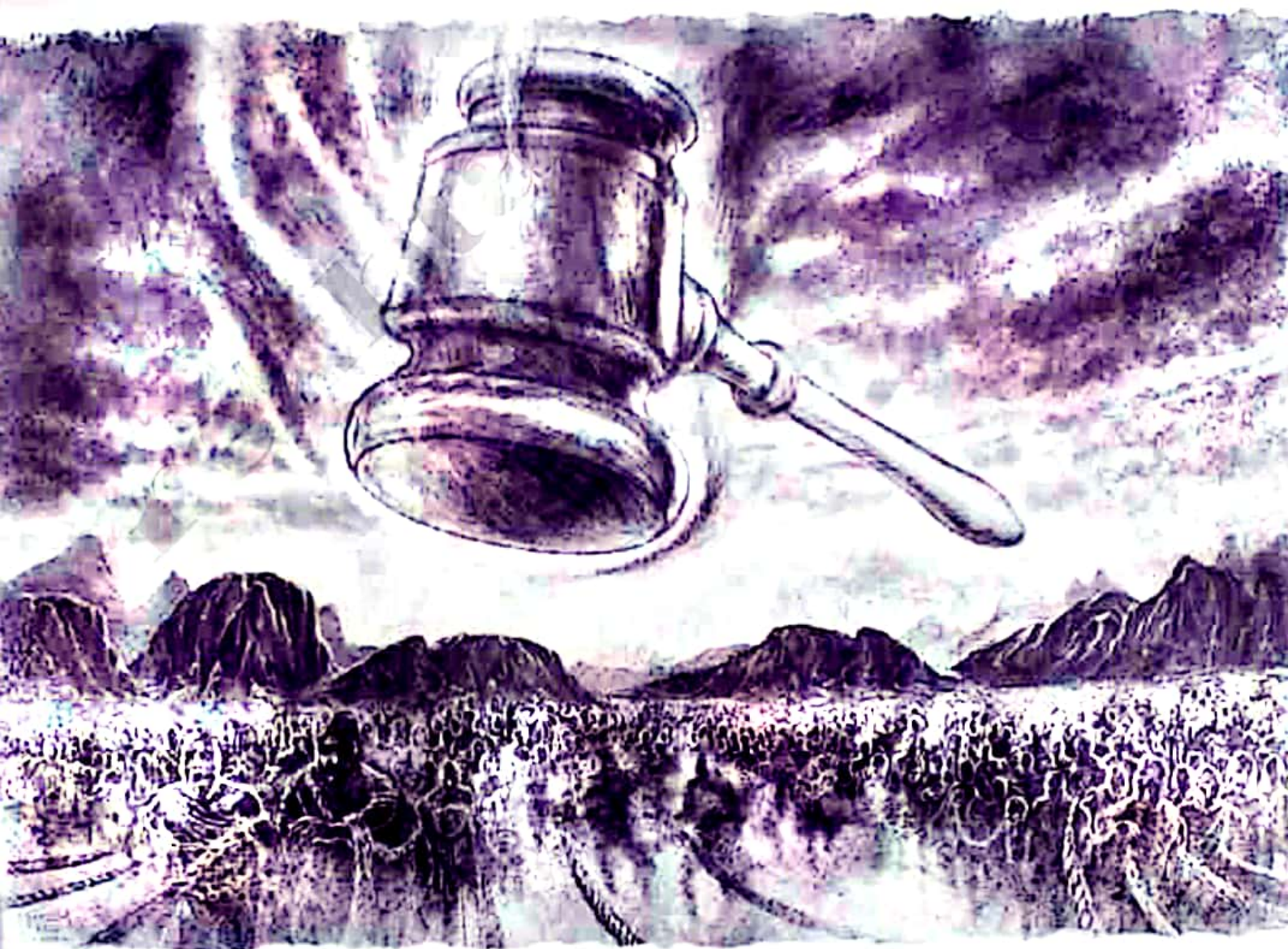
نوحِ عوام

عوام کی آگہی سے انکار کرنے والو' نظامِ کہنہ کے
مردہ خانوں کے ظرف و مظروف اور تابوت بیچ کر
اپنے جیب و دامن
کو بھرنے والو!
سڑاندھ اور گندگی کی پاکیزگی پہ اصرار کرنے والو!
یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے
یہ سب تمھاری ہلاکت انگیز حکمتوں اور سیاستوں ہی کی مرحمت ہے
تمھاری ہی بخشش و عطا ہے

کہ آج ہر چیز اک تمسخر ہے، مضحکہ ہے، ہمارا دل خون ہو گیا ہے
تمھاری غدّاریوں کا الزام اُن شہیدوں کے سر گیا ہے
جنھوں نے آزاد آرزوؤں کے زخم خوردہ بدن میں اپنا لہو اُنڈیلا
تمھاری غدّاریوں کی تعزیر اُن غریبوں کو جھیلنی پڑ رہی ہے جن کی
متاعِ مہر و وفا نہ ہوتی تو اپنی جھولی میں کچھ نہ ہوتا
تمھاری غدّاریوں کا بھگتان اُن دریدہ لباس محرومیوں نے بھگتا
جو اپنے دستِ ہنر سے تہذیب کے بدن کو سنوارتی ہیں
جو خوں شدہ، خوں چکاں تمنائیں اپنے خوں سے
تمام چہرے نکھارتی ہیں
عوام کی آگہی سے انکار کرنے والو، یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے
یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے
پکار اے قوم! میرے مجرم، بھری عدالت میں لائے جائیں
گزرنے والے اور اُن سے پہلے گزرنے والے بلائے جائیں

وہ زخم جو روح پر لگے ہیں وہ زخم سب کو دکھائے جائیں
کُھرچ دیا جائے ہر نجاست کو ہر جہت سے کُھرچ دیا جائے
جو لوگ بوتے ہیں آندھیوں کو، وہی بگولے بھی کاٹتے ہیں
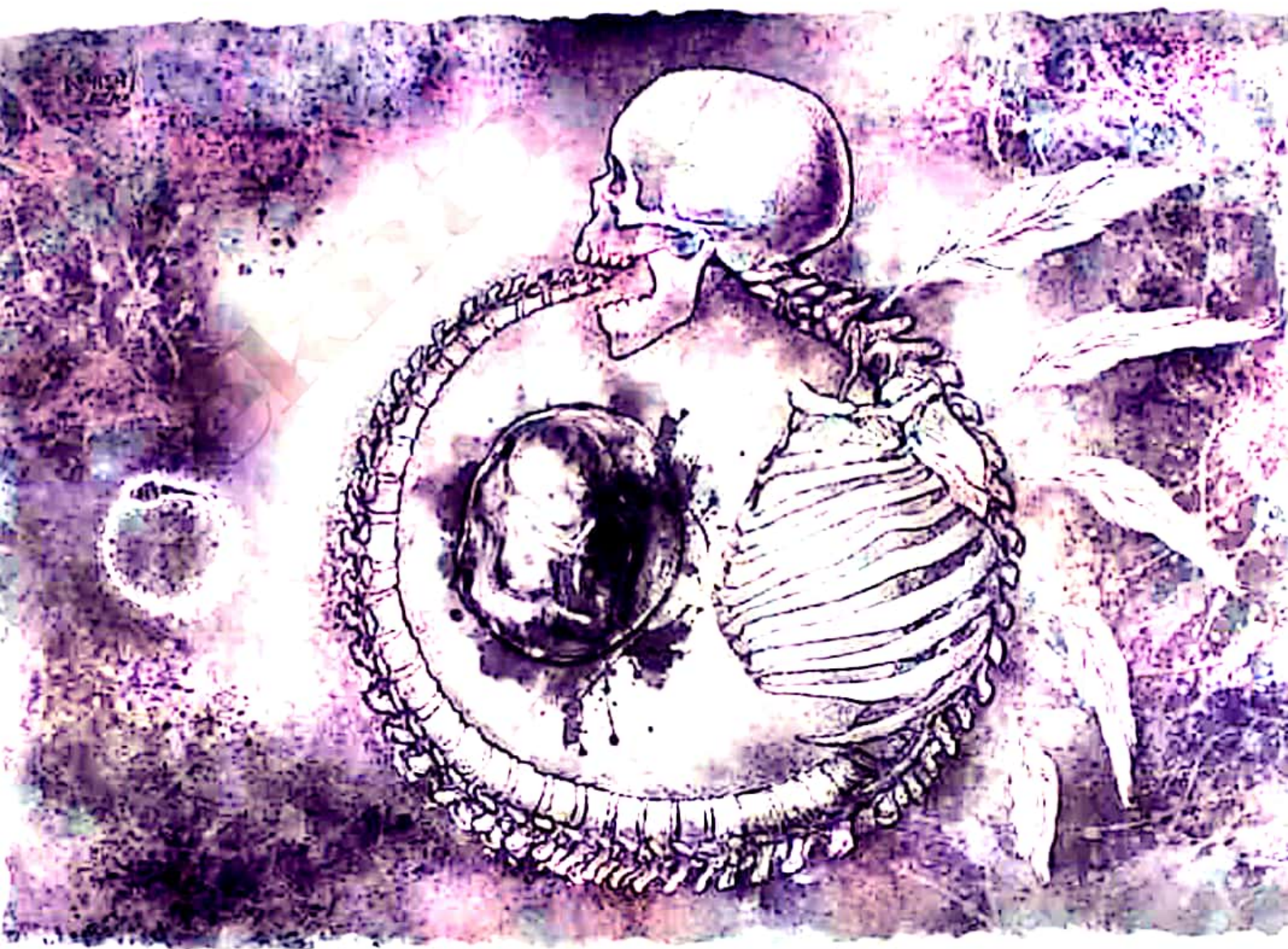
نوحِ شرِ بے سرچشمۂ تر

مزبلے پر پڑا حیض کا ایک لتّا
جو شہوت کے سب سے نفاست پسند آدمی
ایک شاعر کا سب سے بڑا رنگ ہے
رنگ آہنگ ہے اور یہ حیض کا ایک لتّا کوئی منجمد موسیقی ہے
جو اس مزبلے پر پڑی ہے
محلّے کی دوشیزہ، رانوں کے اس بیچ کے رنگ کی
موسیقی کو اُٹھا لے اُسے جیب میں دھر لے
میں جو ہوں، میں تو ہر موسیقی اپنی جیبوں میں لے کر پھرا ہوں
کہ میرے لبوں پر تو ہر سننے والے اُجڈ
اور اَن گھڑ کی خوشنودیاں ہیں

سو اب میرے ہونٹوں کی ہر موسیقی مر رہی ہے جو آواز میری ہے
وہ میرے سینے میں روتی ہے
یا پھر مرے سانس کے سارے پرزوں پہ سوتی ہے
اور سانس ساکت ہیں اور میرا ساکت
کہیں ہے تو جیبوں میں ہے
اور جیبوں کے ٹانکے اُدھڑتے چلے جا رہے ہیں
سو، جو ہے وہ یہ ہے
اور یہ میرا ہے اور سب کو نہیں خود مجھے بھی لبھاتا رہا ہے
یہ 'ہے'، ہاں یہی ہے جو گلیوں، گھروں اور شہروں کو
ملکوں کو اور اِن فضاؤں کو اور کہکشانوں کو احمق بناتا رہا ہے
یہ کیا ہے، یہ اور کون سا ہے؟ یہ 'ہے' میرے اِس پل کا ہے
یا پھر اُس پل کا ہے؟
کیا وہ دونوں کوئی ایک ہیں؟ ایک ہے اور اِک نہیں ہے
میری پلکوں کو چھوڑو کہ وہ میری پلکیں ہیں اور میں تو

اس لجلجاہٹ کی اور اُن سڑاندوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں
اُن جنا ہوں جو پانی کی پیچ اور پوچ الکساہٹ کا بے شجرہ اسقاط ہیں
اور شاید اگر ہو تو کچھ اور ہو اور یہ سب جو میں نے کہا
یا تو وہ میرے بابا کا دھوکا ہو جو میں نے کھایا ہو یا اُن کی
اِک ذہن ہو جس سے اِک باپ نے اپنے بیٹے کو دنیا میں
رہنے کے قابل نہ چھوڑا
مرا باپ بھی خوب تھا اور وہی میرا اُستاد تھا
سارے اُستاد جھوٹے ہیں اور جھوٹ ہی دو کا اُستاد ہے
ایک انسان اور اِک خدا' جھوٹ کے دونوں شاگرد
اِک دوسرے کو سکھاتے پڑھاتے رہے ہیں
مگر اب تو کتنے زمانوں سے میں نے خدا کو پڑھانا' سکھانا
سبھی چھوڑ رکھا ہے
اور اب خدا کی سُنو' وہ تو کاہل تھا' کاہل نے اِک جھوٹ سکھلا کے
اپنے دعوا کناں ہست کے نیست میں صدا ازل ہا ازل کی

عجب فتنہ پرداز اور شور انگیز چُپ سادھ رکھی ہے
اگر وہ نہیں ہے، صد افسوس ہاں وہ خدایاں خدا وہ نہیں ہے تو پھر
آج اِس رات گولائی کے بیچ اور اس کے مدّھم کناروں میں
کوئی بُرائی بھی کیوں ہے
خدا جب نہیں ہے تو پھر او جھڑی میں عبیر اور عنبر
لُبان اور اذفر کے بدلے یہ کیڑوں بھری گند کیسے بھری ہے؟
جو اَب تک نہ ہوتے ہوئے شہر کی ریڑھیوں اور ٹھیلوں
کے چاروں طرف اب بھی موجود ہے
اس سے کہہ دو کہ اپنے نہ ہونے کا اعلان کر دے
کہ اُس کے گماں سے
شرابوں میں پانی مِلا کر دیا جا رہا ہے اور اس جُزرسی کے سہارے
کلیساؤں اور مسجدوں، مندروں، خانقاہوں کی آرائشوں کے
وظیفے بندھے ہیں

روشنی! تُو وہاں تک، وہاں سے جہاں تیری رفتار اِک بارگی
لنگ کرنے لگے تو بس اِک کام کیجو
کہ اپنے جھما کے کو تُو لنگ پر اپنے لِکھ دیجیو:
''میں جہاں تک بھی ہوں اس کے پیچھے اندھیرا ہے
آگے اندھیرا ہے
اور اب جو احوال ہے سُو وہ یہ ہے کہ میں اب
چلوں گی بھی تو بیسا کھیوں پر چلوں گی''
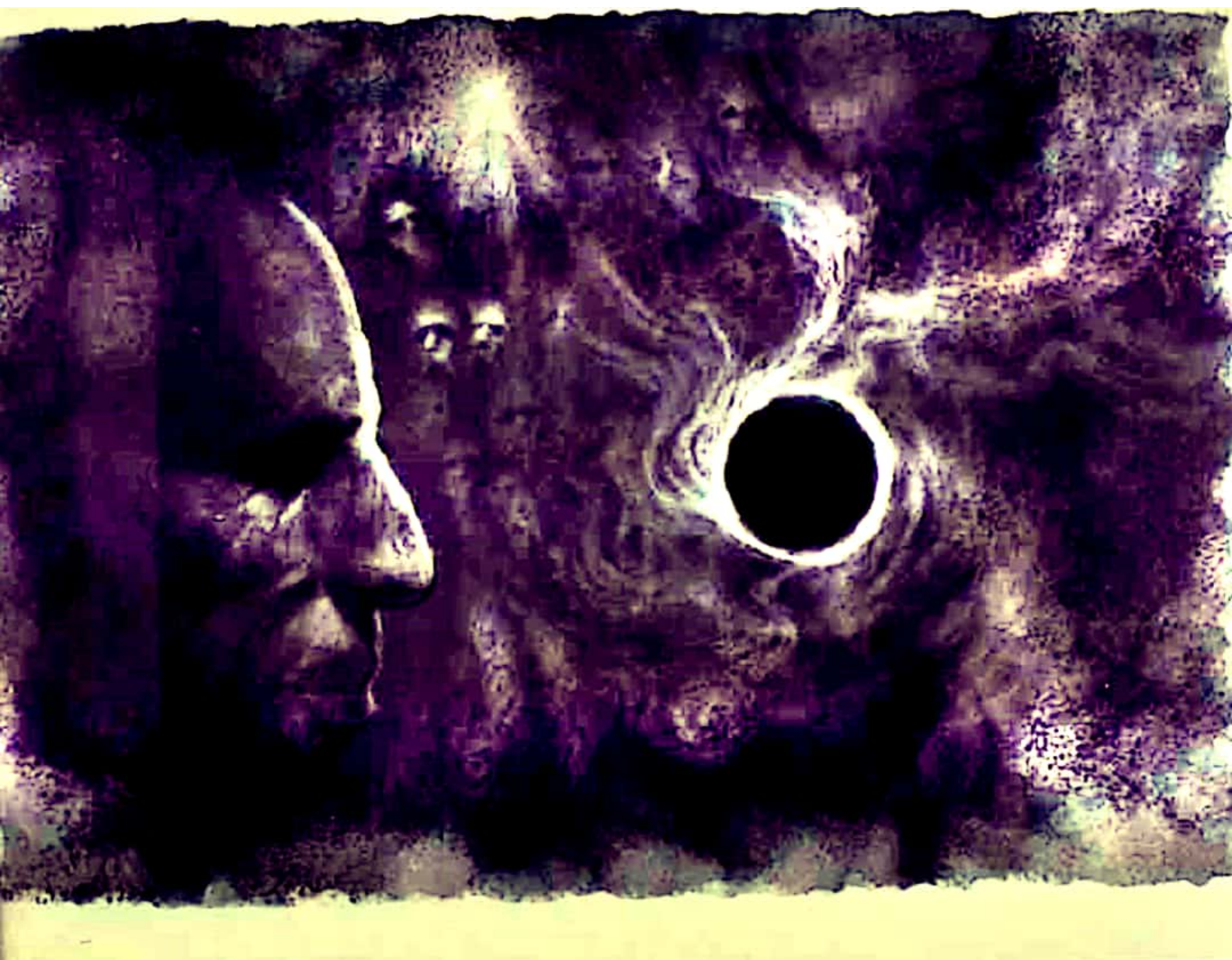
نوحِ آواز

اُن کا سناٹا جو ہیں، اُن کا سناٹا جو نہیں ہیں
سناٹا ہی سناٹا ہے
سناٹے نے دہلیزوں پر سناٹے کے دوش پہ چڑھ کر
دروازوں پر کچھ لکھا ہے
دہلیزوں نے دروازوں پر کیا لکھا ہے؟
لکھا ہے تم شور کو بھی سناٹا پڑھنا
رولے کی دوری میں چلنا، سناٹوں میں آگے بڑھنا
سناٹوں کے گہرے پن نے چوہرے پن میں اندھی اندھیاری پھیلائی

یوں تھا یا پھر یوں تھا جیسے اندھی اندھیاری میں چوہرے پن میں
یا پھر میں یوں کہہ لوں سب کچھ پن میں سناٹے پھیلائے
سناٹے اور اندھیاری میں سناٹا پہلے تھا
یا اندھیاری سناٹے سے پہلے تھی
میں تو سمجھوں سناٹا ہی پہلے ہوگا
اور اندھیاری پیچھے ہوگی
اندھیاری آوازوں کا سناٹا ہے
اور سناٹا آوازوں کی اندھیاری ہے
پھر تو دونوں ایک ہوئے
سناٹا اور اندھیاری دونوں ایک ہوئے
اور یہ دونوں روشنیوں کی پلکوں پر
اور روشنیوں کے پیروں میں
اور روشنیوں کی ساتوں پوشاکوں میں

اور اُن ساری پوشاکوں کے تار و پود میں جن کو سلنا ہے
اور اُن پوشاکوں میں جو اس چوہرے پن کے بقچے میں رکھی ہیں
اپنا پن ڈھکائے ہوئے ہیں
سو تم میرے ہونٹوں سے اک بھید اُچک لو
رولا اک سناٹا ہے جو اپنے آپ کو اپنے آپ سے ڈھکواتا ہے
ہاں وہ اِک سناٹا ہے جو سناٹے کو بہکاتا ہے
روشنیوں کے جتنے بڑ بولے ہیں جو سب گونگے ہیں
روشنیوں کے سُننے پن کی ساری شہوت بہری ہے
اور بہرے پن میں سناٹا ہے
سناٹے میں آوازوں کی اندھیاری ہے
اندھیاری کے سناٹے میں سناٹے کے اندھے پن میں
اندھیاری میں روشنیوں کی پگلی اور پھوکل رفتاریں
اپنے گھٹنے سہلاتی ہیں اپنے گھٹنوں سے جاتی ہیں

اَن دیکھے پن کے اگواڑے سے پہلے ہی
روشنیوں نے اپنے گھٹنوں پر ہلدی مَل لی تھی
سو، پچھواڑے کا تو اب مذکور ہی کیا ہے
بُھنگلے پر کاٹھی کَس لی ہے، کِس نے؟
پچھواڑوں کی کاہکشانوں کی اِک لنگڑی لولی اور بجّی، لے پالک نے
جو اپنی رفتار کی شہوت پر اندھیاروں میں چرتی ہے
روشنی! تُو نے گھاس ہی کھائی

نوحِ تابوت

مرا ارادہ ہر آزمائش ہر ابتلا میں تُلا ہوا ہے
دوام اور دائروں کے مابین میرا پرچم کُھلا ہوا ہے
یہ میں ہوں، جس کا جلوس صدیوں کے مرحلوں سے گزر رہا ہے
یہ میرا تابوت ہے جو قوموں کے درمیاں گشت کر رہا ہے
تمھیں خبر ہے کہ میرا سینہ چھلا ہوا ہے!
مرا جگر خون ہو گیا ہے
تمھیں خبر ہے کہ میرے بازو کٹے ہوئے ہیں
میری لاشوں سے قرن ہا قرن کے مقاتل پٹے ہوئے ہیں

میں بے ادب، بدزبان، گستاخ قاتلوں میں گھرا ہوا ہوں
عتاب بھڑکاؤ، اُن کے حق میں عتاب بھڑکاؤ
میں ظالموں کے خلاف نسلوں کی نفرتیں عام کر کے چھوڑوں گا
میں ساری دنیا میں اُن کو بدنام کر کے چھوڑوں گا

یہ بھی میرا جسم ہے جو کسی صدیوں کے میرے لہو سے رنگ نکھر رہا ہے

یہ میرا ہی لہو ہے جو خشک ہو رہا ہے درمیان خشت گر رہا ہے

[illegible]

تمھیں خبر ہے کہ میرا سینہ چھیدا ہوا ہے

Scanned with CamScanner
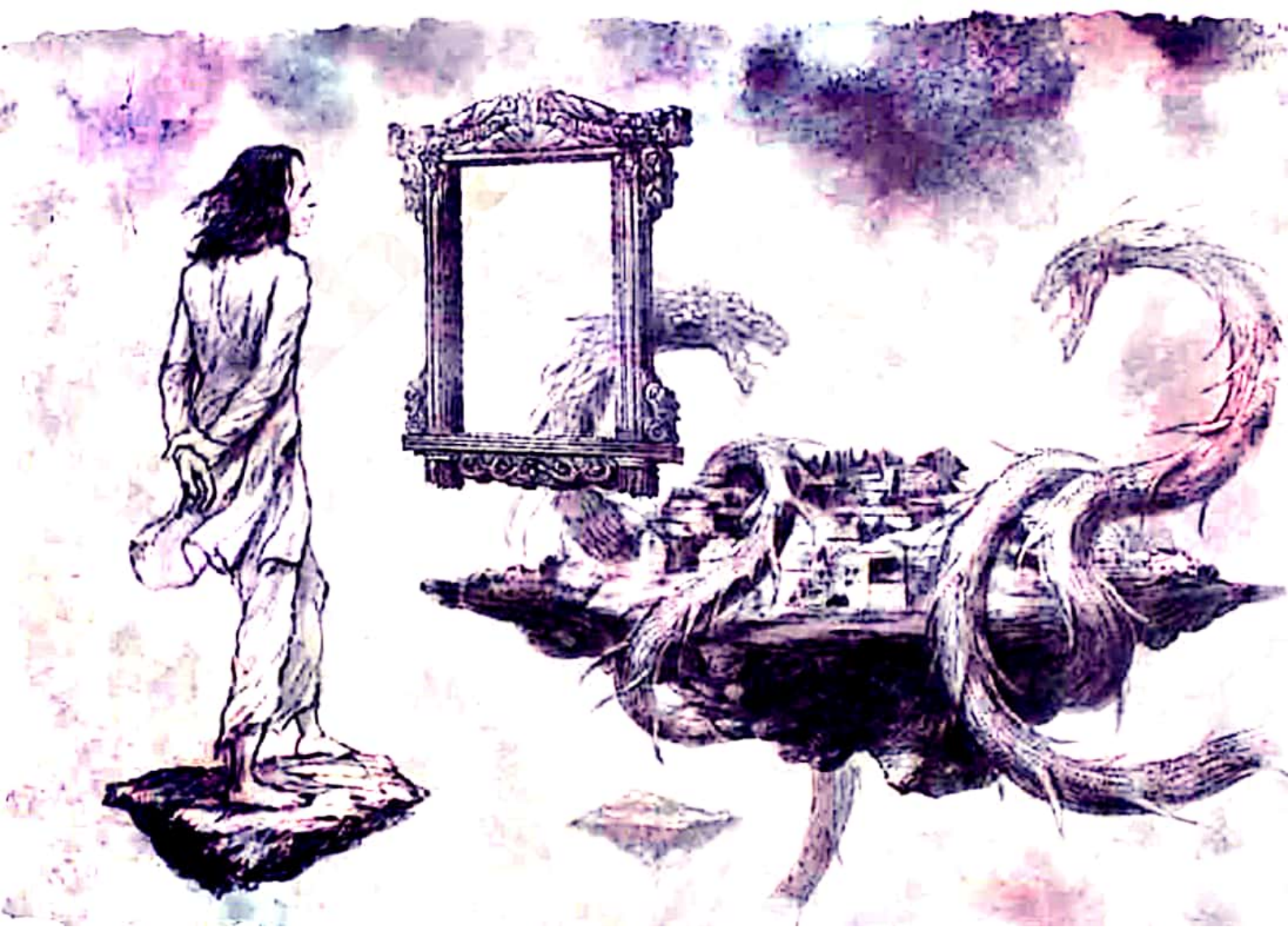
نوحِ ملامت

تمھاری بستی کی ساری مٹی
وہ سب ہوائیں جو اُس پہ چلتی ہیں
وہ بگولے جو اُن ہواؤں میں ناچتے ہیں
وہ سارے جمگھٹ، وہ سارے جھنجٹ
جو دن سے لے رات تک
پلوں پر لکھے ہوئے اپنے سارے بہکاوے
اپنے کھاتوں میں ٹانکتے ہیں، سڑے ہوئے ہیں
تمھاری آواز جو بھی آواز ہے یہاں کی
وہ اپنا سینہ پکڑ کے قے کر رہی ہے

سڑے ہوئے پانیوں کے نزدیک
آسماں کے ڈھلے ہوئے دھیان سے بہت دُور
کیسی بستی میں آ بسے ہو؟
میں اپنے اس سر کی دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں کہ سب سے اُونچی چھتوں کے سینے پہ
آگ کے سانپ لوٹتے ہیں
پڑوس کی ساری بستیوں کی کمینگی، کینہ پروری اور کٹھور پن کا شکار ہو تم
کہاں کا بسنا، کہاں کی بستی، وہاں بسائی گئی ہے بستی
جہاں تمھاری تمام محنت کی جو کمائی ہے
وہ فقط جھینپ اور جھجک ہے
فقط جھکاوٹ ہے
تم اپنی آنکھوں کو اپنی جیبوں میں ڈال لو!
ڈال بھی چکو اب!

سو اب ذرا کھڑکیوں کے پاس آن کر کھڑے ہو
کھڑے رہو اور اب ذرا کھڑکیوں سے پوچھو
بھلا وہ کیا ہے جو کھڑکیاں بھی نہ دیکھ پائیں
انھوں نے دیکھا تمھاری بستی کو اس کے ٹخنے پکڑ کے اور ٹینٹوا جکڑ کے
اُدھر سے وہ ہے جو کھینچتا ہے، اِدھر سے وہ ہے جو اینچتا ہے

نوحِ بُرج

ہیکلوں کے دراز ریش ژندہ پوش کاہنو! میں پہلے مغرب کی زمینوں سے اور پھر مشرق کی زمینوں سے تمھاری سرزمین میں آیا ہوں۔ میں نے شہروں کی اس شاہ بانو خطوں کی اس خوزادی اور پھر بستیوں کی اس بدبخت باندی بابل کو اپنی ڈحول میں اٹی ہوئی پلکیں تھکا کر اپنی آنکھوں کے ڈھیلوں کی ڈکھن میں دیکھا ہے۔ اب میں تمھارے بُرج کے تلووں میں پڑا ہوں یا پھر میں نیچائیوں کی نیچائی میں کھڑا ہوں۔ کھوئی ہوئی آنکھو اور فراز افراز کی نیلگونی میں سوئی ہوئی نگاہو! مجھے بتاؤ کہ اس بُرج کی سب سے اُوپر کی منزل میں کیا ہے۔ کیا وہ سب سے اُوپر کی منزل ہونے کے سوا ہے؟

ارے۔۔۔ کے لوگو! کون بولتی ہوئی سانسوں کو ہونٹوں پر لائے گا اور پوچھنے والے کو بھلا کون بتائے گا؟ اَمی صاروقا! تم یا تم تخن میں آؤ ہمارے بڑوں کے بڑے میری کہن کے پھوہڑپن پر نہ جاؤ اور تم بات کی بڑائی میں نہ بڑاؤ ہاں تم ہی سناؤ وہ کچھ تم ہی سناؤ جسے نینوا اشور کلدانیہ اور ہاں اپنے اس معمور کے پڑاووں کے سارے مزدور جانتے ہیں اور وہی نہیں اسے تو آسمانوں کی ہیکلیں بھی جانتی ہیں اور بکھانتی ہیں۔ داڑھیوں کو آنسوؤں سے بھگو لو کہ پڑاوے کا پڑاوہ کھنگر ہو گیا ہے۔ تو اے نجانے کہاں کے مسافر! میں تجھے بتاتا ہوں اس بُرج کی سب سے اُوپر کی منزل میں ایک چھپرکھٹ ہے اور اُس چھپرکھٹ پر خدایاں خدا آرام کر رہا ہے۔ فیسون کے بہاؤ کے پھیلاؤ اور اس کے پاٹ کی گیلاہٹ نے اپنی بھیگی ہوئی ہواؤں سے بُرج کی سب سے اُوپر کی منزل کی رمز کو ہمیشہ ہمیش کی نیند میں کھو لیا ہے اور مادٗ عیلام کے ضلعوں اور رحموں کے گاڑھے پانیوں اور گنڈاروں کو بڑبڑاتے ہوئے خوابوں میں مبہوت کر دیا ہے۔

اپنے بائیں طرف بیٹھ کر، میں نے دائیں طرف کی جگہ گھیر لی ہے
تُو جو تُو ہے سو، تجھ کو جگہ گھیرنے کی ہوس ہے
سو، تیری ہوس نے جہت سے جہت تک بھلا لاجہت کے سوا کیا کمایا
کیا کمایا، کسی نے بھی گہرائی میں اور چوڑائی میں اور لمبائی میں
کیا کمایا بھلا؟
تُو نے پھیلاؤ سے کچھ بھی پایا بھلا، جو ترے جسم کی جلد کو چُھو رہا ہے
خبر ہے تجھے وہ ترے جسم کی جلد سے لانہایت کی دُوری میں
موجود ہو تو بڑی بات ہے
پر، وہ ہونے میں تھا ہی نہیں اور ہے ہی نہیں
یوں کہ وہ تیری نسبت سے ہے ہی نہیں
میں نے پلکوں، پپوٹوں، بھوؤں اور آنکھوں کے ڈھیلوں کو
آنکھوں کی پتلی سے کتنا بچا کر رکھا ہے

میرے ڈھیلوں کی گیلی سفیدی جو پتلی کو سیراب کرتی رہی ہے
بہت باؤلی ہے
یہ بونگی ہے
اس سے کہو تُو نے جس رنگ کی لائیت کو وظیفے دیے ہیں
وہ بس سات دھوکوں کی دُھو میں اُڑاتی رہی ہے
یہ کس نے کہا رنگ ہی جسم ہے اور جنبش ہے اور وزن ہے
اور اب میں یہ بکتا ہوں یہ رنگ، یہ جسم اور جسم کے سارے احوال
یا چائے کے ایک فنجان کی بھاپ ہیں
یا مرے اس قرابے کی سیال تلخی ہیں
اور میرے قرابے میں اس آن جو کچھ بچا رہ گیا ہے
وہ اِک گھونٹ ہے
یا کسی سے کئی گھونٹ پینے کے سوچے ہوئے کچھ بہانے ہیں
ایک یا دو کے اندازے کی جو مشقت ہے

وہ آسمانوں میں شاید خدا کی بھی نیندیں اُڑا دے گی
اس ہول میں جب سے بھی ہے خدا
یوں کہو تم، اگر ہو بھی سکتا خدا تو وہ سوتا ہی رہتا
کہ اندازہ سب سے بڑا ہول ہے اور بس نیند ہے
اور مجھے نیند آنے لگی ہے
سو میں پڑ رہوں بُرج کے پائے میں پڑ رہوں، پڑ رہوں میں
مگر کس کے پہلو میں پلکوں کے دَر بند ہوں؟

نوحِ طمع

ملامتوں اور نفرتوں کے سوا مرے پاس اور کیا ہے
اور ان دیاروں میں جو بھی رمزِ آگہی کے ایما پہ اپنا سینہ جلا رہے ہیں
جو اپنے غصّوں کو آپ سہتے ہیں اُن کا سرمایہ اور کیا ہے
یہ وہ تبرک ہے جس کو لینے کے واسطے کوئی کیوں بڑھے گا
جو خون کے گھونٹ پی رہا ہے وہ جانتا ہے کہ نسلِ آدم کی کیا سزا ہے
میں چاہتا ہوں کہ نسلِ آدم کے ہر ٹھکانے کو
ناخنوں سے کُھرچ کے رکھ دوں
لبوں کی جنبش کا پردۂ گوش سے جو رشتہ ہے اس میں کیا ہے
جو بولتا ہے وہ کرتبی ہے، جو سُن رہا ہے وہ مطلبی ہے
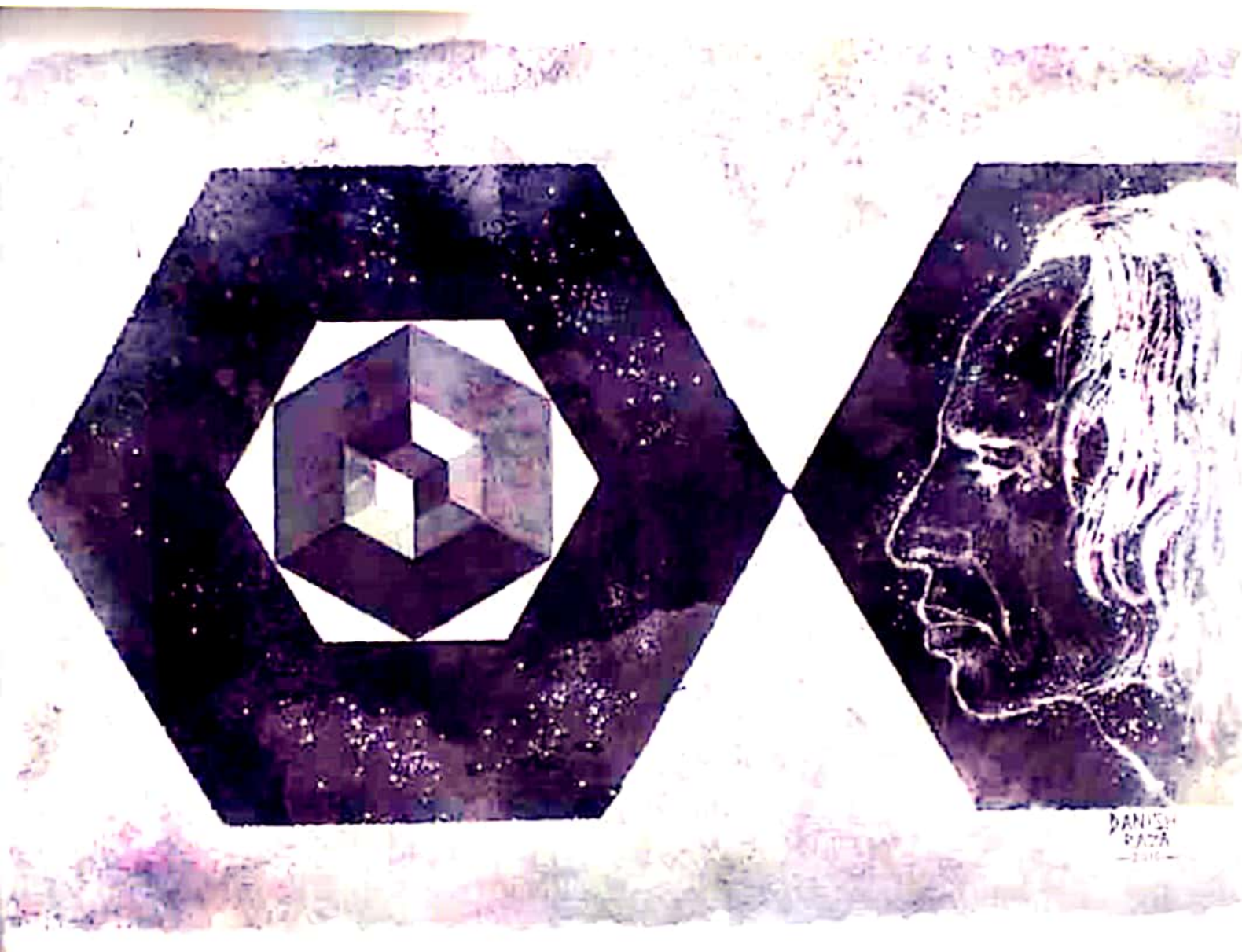
نوحِ جہت

ایک دو اور پھر تین اور پھر چار، پھر پانچ اور چھے
یہ روزینہ ساری نگاہوں کا روزینہ ہے
اس کو تم میرے کشکول میں ڈال دو
میرے کشکول میں ہر جہت ہاتھ پھیلائے
رفتار کی گرد سے بھیک مانگا کرے گی
ہر جہت میری پلکوں کے کشکول میں ہے
اور ہر وہ جہت میرا کشکول جس سے تہی ہے
اسے میں خدا کو ہبہ کر چکا ہوں

ہر جہت بے جہت ہے، جہت کی جہت لا جہت ہے
سو، پھر ہر جہت اپنے 'لا' میں تمھاری زمینوں، زمانوں، مکانوں
اور اُن آسماں آسمانوں کا بس اک تلفظ ہے
جس کے کسی حرف اور لفظ کا کوئی مطلب نہیں ہے
وجود اور موجود اور ہاں ایک ان کے لوارے کو (تاریخ کو)
مرتبانوں میں لہسن، کلونجی، نمک اور میتھی کے
اور سونف کے ساتھ بھر دو
پھر ان مرتبانوں کو سر بند کر کے
انھیں نور کی دھوپ میں دھر دو
یہی ایک صورت ہے
جس سے وجود اور موجود اور اپنی تاریخ
اثبات کی خوش خوراکی کے کام آ سکے گی
میں نے پیچھے سے ژرفا، درازا، فراخا کو

اور اُن کے روغن کو
اُن کے مسالے کو پہلے گھمایا
اور پھر طشتری میں نکالا تو پھر ایک نوالہ نہیں
میں نے تو دو نوالے لیے
ہاں، وجود اور موجود تاریخ
تاریخ کیا دہر، دیموم اور وہ کچھ
جو ان کے حسابوں میں لکھا گیا ہے
وہ اک چٹپٹا پن ہے
جو تم کو کم اشتہا میں بھی دو
ہاں، دو نوالے تو کھلوا ہی دے گا
ایک 'ہے' کا نوالہ اور اک 'نہیں' کا نوالہ ہے
کاف اور لام، اور میم اور ہے

فرہنگ

ابتلا مصیبت، آزمائش۔

اُر دجلہ اور فرات کی وادی کا ایک قدیم شہر جو ۲۵۰۰ قبل مسیح میں سومری بادشاہوں کا دارالحکومت تھا، حضرت ابراہیم کا وطن۔

اذفر ایک خوش بُو، تیز بُو۔

از ہم گسستہ جُدا جُدا، الگ الگ، بکھرا ہوا۔

اسطوانہ ستون۔

اسقاط حمل گرنا یا گرانا۔

اَشباح اجسام، سائے، بھوت۔

اشور آشور، آسور، دریائے دجلہ کی ایک وادی کا علاقہ، وہاں کے رہنے والے آشوری کہلاتے تھے جو پہلے بابل کی حکومت کے تحت تھے، ۱۸ ویں سے ۱۵ ویں صدی قبل مسیح میں آزاد ہوئے۔ یہ شہر ان کا پہلا دارالحکومت تھا، پھر کالح اور پھر نینوا ان کا پایۂ تخت بنا۔

اَعراض عارضی چیزیں، سانحے، آبروئیں، خواہشیں، عرض (چوڑائی) کی جمع۔

اگواڑے آگے کا حصہ، آنگن۔

اَلا یلَلّی	اظہارِ مسرت کے لیے بے معنی الفاظ یہ اور اس سے ملتے جلتے کئی الفاظ اسی مقصد کے لیے رومی کی غزلیات میں بھی موجود ہیں۔
الکساہٹ	سستی، کاہلی۔
اندھیاؤ	اندھیرا، اندھیر۔
اہرمن	شیطان، شر کی قوت۔
ایاہ حزناہ	افسوس، ہائے افسوس۔
ایزاد	اضافہ کرنا، بڑھانا۔
اینچنا	کھینچنا، کسنا، اپنے ذمے لینا۔
بابل	دریائے دجلہ کی ایک وادی کا ایک قدیم شہر جو آشوریوں کا تیسرا پایۂ تخت رہا۔
برجِ بیوگانِ باکرہ	دوشیزہ بیواؤں کا کئی منزلہ محل۔
برزن	گلی، محلہ۔
بُریدنی ہا	کاٹنے کے قابل چیزیں۔
بطالت	شجاعت، دلیری، بے کار رہنا، یاوہ گوئی۔
بقچہ	تھیلی، پوٹلی، گٹھڑی، کپڑا جس میں ساز و سامان سمیٹا جائے۔
بکھانا	بنانا، پیدا کرنا، بیان کرنا۔

بلاغ	پیغام دینا' بات پہنچانا' کافی سمجھنا۔
بھٹ	غار' بل' سوراخ' بھاٹ۔
بہم پیوستہ	متصل' ملے ہوئے' جڑے ہوئے۔
بہم فشار آوری	ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنا' بھینچنا۔
بھُنگا	برسات میں پیدا ہونے والا ایک باریک کیڑا جو اُڑتا ہے۔
بے درنگ	فوراً' بے تامل۔
بیرق	بندوق' پرچم۔
بے محابا	بے ادب' بے تکلف' بے دریغ۔
پژاوہ	بھٹی' آوا۔
پلاس پوش	ٹاٹ پہننے والا' خرقہ پوش۔
پوچ	اندر سے خالی' کھوکھلا' بے کار' بے معنی' بے ہودہ۔
پَہنا	عرض' چوڑائی۔
پھوکل	کھوکھلا' اندر سے خالی' کنگال۔
تابش	چمک۔

تار و پود	تانا بانا۔
ترقیمہ	اختتامی یادداشت، خاتمہ۔
تناقض	تضاد۔
ٹینٹوا	حلق، گلا، نرخرا۔
جارُوب کش	جھاڑو دینے والا۔
جبالِ حورب	حوریب، جبل سینا، کوہِ طور۔
جُزرس	چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھنے والا۔
جھونجھل	غصہ، کوفت۔
حجابِ اقصٰی	دور ترین یا سخت ترین پردہ۔
خشِن	کُھردرا، موٹا۔
خُوزادی	نخرے والی، بدمزاج عورت۔
خوں چکاں	جس سے خون ٹپک رہا ہو۔
خُن خُنا	تلاشِ بسیار کے باوجود لغات میں اس کے معنی نہیں ملے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ ناک سے بولنے کو خُن خُنانا کہتے ہیں۔
خُنگر	ناک سے بولنے والا۔

دادخواہ	انصاف کا طالب، مظلوم۔
داعیہ	ارادہ، خواہش۔
درازا	طول، لمبائی۔
دراز ریش	لمبی داڑھی والا۔
درخش	روشنی، چمک۔
دریدنی ہا	پھاڑنے کے قابل چیزیں۔
دہ چند	دس گنا۔
دیموم	دوام، ہمیشگی۔
دیّوث	بے غیرت، بھڑوا۔
راموز	سمندر، اصل بات
رَجز	میدان جنگ میں گائے جانے والے فخریہ اشعار۔
رؤیت	دیدار، زیارت۔
زمہریر	شدید سردی یا بے حد ٹھنڈی جگہ۔
ژرفا	عمق، گہرائی۔

ژندہ پوش	پھٹے پرانے لباس والا۔
سُرین	کولھا' چوتڑ۔
ژولیدہ مُو	اُلجھے' بکھرے ہوئے بالوں والا۔
سڑاندھ	بدبو'تعفن۔
سقیط	قبل از وقت مردہ پیدا ہونے والا بچہ۔
سمک	مچھلی' پنڈلی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے' خوب صورتی' دل کشی۔
سیلِ سیال	سیلابی ریلا۔
سیلِ قاہر	شدید سیلاب جس کی تباہ کاری بہت زیادہ ہو۔
شامِ پائیز	موسم خزاں کی شام۔
شاہ بانو	شہزادی' ملکہ۔
شکستنی ہا	ٹوٹنے یا توڑنے کے قابل چیزیں۔
شورہ پُشت	جھگڑالو' نافرمان۔
شیرازہ	کتاب کی جلد کا دھاگا جو صفحوں کو اکٹھا رکھتا ہے۔
طویلہ	اصطبل' جانور باندھنے کی رسّی۔

طیلسانِ اسود	کالی چادر یا جُبہ۔
عبیر	عرق گلاب، صندل، زعفران اور مشک سے بنائی گئی مرکب خوش بو۔
عطرِ منشم	تا دیر رہنے والی خوش بو۔ قدیم عرب کی ایک عورت کا نام جو خوش بو بیچا کرتی تھی۔ جب دو عرب قبیلوں میں جنگ ہوتی تو کہا جاتا تھا "ان کے درمیان عطرِ منشم ڈال دو۔" (مفتی عبدالرحمن کی تحقیق)
عفونت	بدبو، خراب ہو جانا۔
عنبر	ایک خوش بو جو ایک خاص آبی جانور سے حاصل ہوتی ہے۔
عیلام	تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کا ایک قدیم ملک جو موجودہ ایران کے خوزستان، لرستان وغیرہ کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ عیلامیوں نے عظیم سلطنت قائم کی۔ آشور و بابل سے ان کی جنگیں رہتی تھیں۔
فراخنائے	کھلی، چوڑی گزرگاہ۔
فرازِ افراز	بلندی، بلندی کا آخری سرا۔
فیسون	بائبل کی روایت کے مطابق باغِ عدن سے جاری ہونے والے چار دریاؤں میں سے ایک دریا کا نام۔ اسے سیحون بھی کہا جاتا ہے۔
فضلہ	بچا کھچا، پاخانہ۔
فنجان	پیالی۔

قرابہ	صراحی، شراب کی بوتل، شیشے کا برتن۔
قیر وکزف	سیاہی، سیاہ روغن۔
قرن	صدی۔
کالبُد	جسم، ڈھانچا۔
کانونِ اوّل	سُریانی کیلنڈر کا تیسرا مہینا۔
کاہن	غیب کی خبریں دینے والا، قدیم مصریوں، بابلیوں اور یہودیوں کے روحانی پیشوا۔
کلدانیہ	چار ہزار قبل مسیح میں دجلہ وفرات کے درمیان ایک مملکت۔
کائن	مخلوق، موجود، حادث۔
کوی	گلی۔
کھنگر	زیادہ پکی ہوئی یا جلی ہوئی اینٹیں۔
گذشتنی ہا	گذر جانے والی چیزیں۔
گرامی نژاد	اعلیٰ نسل کا، اچھے خاندان کا۔
گرد باد	بگولا۔
گندہ بغل	جس کی بغلوں سے بُو آتی ہو۔

گِنڈار مقامی لفظ۔ گندگی سے پیدا ہونے والے کیڑے۔ (امروہے کے ساکنان ضیاء البدر اور ابوتراب نقوی کے تعاون سے۔)

لائیت عدم، نہ ہونا، فنا۔

لُبان (لوبان) خوش بُو، ایک درخت جس کی لکڑی یا برادہ جلانے سے خوش بُو پیدا ہوتی ہے۔

لَتّا کپڑے کا ٹکڑا، چیتھڑا۔

لنگ لنگڑاپن، لنگڑا، پنڈلی۔

لوارا گائے کا بچہ، بچھڑا۔

ماد موجودہ ایران کے آذربائیجان کے جنوبی اور نواحِ ہمدان کے علاقوں کا خطہ، وہاں کی قدیم آریائی نسل قوم جنھوں نے ۷۰۵ ق م میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ یہ علاقہ اور قوم آشوریوں کے حملوں کا نشانہ بنتے رہے۔ ۵۵۰ ق م میں ایران کے ہخامنشی بادشاہ کورش کبیر نے اس حکومت کا خاتمہ کیا۔

متکوّن وجود میں آنے والا، پیدا ہونے والا۔

متمسّک وابستہ، سہارا لینے والا، رجوع کرنے والا۔

مثلّث تکون۔

مجہول نامعلوم، بے معنی، احمق۔

مخروط پوش مخروطی ٹوپی پہنے ہوئے۔

مَرایا	آئینے۔
مَصاف	میدانِ جنگ، جہاں صف آرائی ہو۔
مکاشفہ	انکشاف، کشف۔
مضرَت	نقصان۔
نَرگُل	نرسل۔
نَسّاب	ماہر انساب، شجرۂ نسب جاننے اور بیان کرنے والا۔
نسناس	بن مانس۔
نینوا	دریائے دجلہ کے کنارے عراق کے موجودہ شہر موصل کے سامنے کا ایک قدیم و عظیم شہر۔ آشوری بادشاہوں کا تیسرا پایۂ تخت۔ ۶۱۲ ق م میں مادیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔
نوشتہ	لکھا ہوا، تحریر۔
واحزیناہ	وائے افسوس۔
ہبہ کرنا	بخشنا، عطا کرنا۔
ہزار خصمی	ہزاروں شوہروں والی، بے وفا عورت۔
ہیکل	عبادت خانہ، خانقاہ، تعویذ، پیکر۔

Scanned with CamScanner